مطلع
آفتاب حسین

مطلع

مطلع

آفتاب حسین

سیمانت پرکاشن
دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت : ایک سو ساٹھ روپے -/۱۶۰
اشاعت : ۱۹۹۹ء
طباعت : انیس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی ۲
خطاط : محمد ریاض خان
ناشر : نریندر ناتھ سوز

سیمانت پرکاشن
۹۲۲- کوچہ روہیلا خاں
دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

MATLA
GHAZALS

AFTAAB HUSSAIN
Rs. 160.00

SEEMANT PRAKASHAN
922, Kucha Rohella Khan
Daryaganj, New Delhi-110 002
Phone : 3270284, 3281880

ثم اتبع سببا ۝
حتیٰ اذا بلغ مطلع الشمس
وجدھا تطلع علیٰ قوم
لم نجعل لھم من
دونھا سترا ۝

پھر اُس نے (سفر کا) ایک اور سامان کیا۔ یہاں تک
کہ وُہ طلوعِ آفتاب کی حد تک جا پہنچا اور اُس نے
دیکھا کہ سُورج اُن لوگوں پر طلوع ہو رہا ہے جن کے
واسطے ہم نے دُھوپ سے بچنے کے لیے کوئی
اوٹ نہیں بنائی تھی۔ (الکہف: ۸۹-۹۰)

عابد کے نام

دیکھے کوئی تعلّقِ خاطر کے رنگ بھی	ستاون
اپنے آپ کو دیکھ رہا ہُوں حیرانی سے	اُنسٹھ
کمی رکھتا ہُوں اپنے کام کی تکمیل میں	اِکسٹھ
تنہائی، سکوت، ہوا، پانی	تریسٹھ
اپنا دیوانہ بنا کر لے جاتے	پینسٹھ
کہاں کسی پہ یہ احسان کرنے والا ہُوں	سَڑسٹھ
جب سفر سے لوٹ کر آنے کی تیاری ہُوتی	اُنہتّر
قیام کرنے چلا ہُوں مَیں اِک نئی زمیں پر	اِکہتّر
وجُود کا اِنحصار گو خاک پر نہیں تھا	تہتّر
جو ناگوار ہے سب کچھ گوارا کرتے ہُوتے	پچھتّر
چیخ اُٹھو کہ کرا ہو صاحب	سَتتّر
ذرا سی دیر کو چمکا تھا وہ ستارہ کہیں	اُناسی
قدم قدم پہ کسی اِمتحاں کی زد میں ہے	اِکاسی
رُوحوں کی خاموشی میں آواز لگاتے رہا کرو	تراسی
خُوشبُو کی طرح دِل میں بسا کر اُسے دیکھو	پچاسی
وہ سر سے پاؤں تک ہے غضب سے بھرا ہُوا	ستاسی
مِرے یقیں کو پَسِ پردہ گماں کر کے	نواسی
نگاہ کے لیے اِک خواب بھی غنیمت ہے	اِکانوے
بَس ایک بات کی اُس کو خبر ضرُوری ہے	ترانوے
دِلِ حزیں ہمارے ہاتھ اگر ترِی کمند ہو	پچانوے

اُجڑتی سرزمیں پر پھر کئی منظر اُتر آئے بہاروں کے	ستانوے
منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا	ننانوے
دَرد کے راہی، غموں کی رہ گزُر، تنہائیاں	ایک سو ایک
غم کی لَے پر تھرک رہی ہے رات	ایک سو تین
کسی طرح بھی تو وہ راہ پر نہیں آیا	ایک سو پانچ
باغی ہُوتی ہے ہم سے تو اپنی سپاہ تک	ایک سو سات
اَفراتفری بھی ایسی جلدی میں	ایک سو نو
منزل ہاتھ نہیں آپاتی، خواب ادھورا رہ جاتا ہے	ایک سو گیارہ
جب کوئی آئینہ بھی نہ تھا میرے سامنے	ایک سو تیرہ
معنی کی زَد میں ہُوں، کبھی لفظوں کی مار پر	ایک سو پندرہ
راس آگئی نظر کو جو آب دہوائے خواب	ایک سو سترہ
خواب کی رُت سے تعبیر کے سَبز رُو موسموں کی طرف	ایک سو اُنیس
دِل بھی آپ کو بھُول چکا ہے	ایک سو اکیس
یاد یہ کس کی آ گئی گردشِ روزگار میں	ایک سو تئیس
میں سوچتا ہُوں اگر اِس طرف وُہ آجاتا	ایک سو پچیس
کِسی نے دی تھی دَرِ خواب پر کبھی دستک	ایک سو ستائیس
گزُر اَوقات ہوتی ہے کہیں خوابوں میں کھو کر بھی	ایک سو اُنتیس
دُھوپ جب ڈھل گئی تو سایہ نہیں	ایک سو اکتیس
اصلِ حالت کا بیاں ظاہر کے سانچوں میں نہیں	ایک سو تینتیس
بکھرتا حَرف ہُوں، خُوش رنگ سی تصویر ہو جاؤں	ایک سو پینتیس

دیباچہ

دوستوئیفسکی کا ایک کردار کہتا ہے :

"حماقت ۔ غیر فنکارانہ عمل ہے اور اس کی عُمر مختصر ہُوا کرتی ہے۔
لیکن ذہانت جگہ بدلتی ہے اور اپنا آپ چھُپاتی ہے۔"

افسانہ ہو یا ناول، غزل ہو یا نظم ۔ ہر دَور میں اعلیٰ اور غیر معمُولی معیاری تحریریں اپنا آپ چھُپاتے رکھتی ہیں ۔ ان کی تعداد کم ہوتی ہے کیونکہ اعلیٰ اَدب محض مقدار سے نہیں، معیار سے پَیدا ہوتا ہے اور یہ نِسبتاً سُست رد عمل ہے ۔ اِسی لیے جلد بازی سے لکھی گئی سَرسری اور غیر معیاری تحریریں سچّے اَدب کو کچھ عرصے تک دباتے رکھتی ہیں لیکن یہ سِلسلہ تا دیر چلا نہیں کرتا۔

ہمارے اَدب پر بھی اِن دِنوں حماقت کا غلبہ ہے، جس کی عمر ہمیشہ کی طرح اِس مرتبہ بھی مختصر ہوگی —— غزل کی حالت تو اَور بھی دِیدنی ہے کہ یہ بیچاری ایسی صنف ہے جِس میں طبع آزمائی کرنا ہر شاعر اپنا پیدائشی حق خیال کرتا ہے۔ ہمارے اکثر مُبتدی شاعری سے "قافیہ پیمائی" کے حوالے سے متعارف ہوتے ہیں اور اِس سَرسَری شناسائی کی بُنیاد پر ہی مشقِ سخن کا آغاز کرتے ہیں اور ساری عُمر غزل کا قافیہ تنگ کیے رکھتے ہیں ۔ انھیں کبھی یہ بات سمجھ نہیں آ سکتی کہ غزل محض قافیہ پیمائی کا نام نہیں اور اگر ایسا ہے بھی تو بقول ناصر کاظمی یہ قافیہ پیمائی کر کے دکھانا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری غزل اَدنیٰ اَور درمیانے درجے کی شاعری سے بھری پڑی ہے ۔ اِسی لیے غزل شدید ترین تنقید کی زَد میں بھی آئی، اسے درباری صنفِ سخن کہا گیا اور غزل گو شعُراء کو "اَن پڑھ" تک قرار دیا گیا۔

لیکن غزل کی خُوش قِسمتی دیکھیے کہ عین جب اس کے کفن دَفن کے امکانات دکھائی دینے لگتے ہیں، کچھ جاندار تخلیق کار سامنے آجاتے ہیں اور اس مُردے میں پھر جان پڑ جاتی ہے ۔ ۶۰ ۔۔۔

کی دہائی میں جب غزل کو باقاعدہ طور پر رد کر دیا گیا۔ اس وقت بھی لسانی تشکیلات کے شور کے عقب میں ناصر کاظمی، منیر نیازی، عزیز حامد مدنی، ساقی فاروقی، سجاد باقر رضوی، احمد مشتاق، جون ایلیا اور محبوب خزاں جیسے باکمال شعراء نے اس صنف کا بھرم قائم کیے رکھا۔ آج بھی سامنے کے منظر سے پرے وابستگی اور سنجیدگی سے لکھنے والے اپنا کام کیے جاتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ دھند بھی چھٹ جائے گی جو آج ہمارے پورے ادبی منظر اور بالخصوص غزل پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یوں بھی لکھنے والا ذہین اور باصلاحیت ہو تو اصناف کا امتیاز ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

غزل کی جو خوبی ہے وہی اس کی خامی بھی ہے۔ یعنی اس کا ڈسپلن اور مخصوص ڈھانچہ اسی لیے غزل میں نئی بات پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس کی تنگ دامنی کو وسعت دینے کی کوششیں ہر دور میں کی جاتی رہی ہیں لیکن تجربات کا یہ سلسلہ (ظفر اقبال کی غزل کو چھوڑ کر) زیادہ تر موضوعاتی سطح پر ہی جاری رہا ہے۔

۷۰ء کی دہائی میں بھی اردو غزل کی صورتِ حال پر از سرِ نو غور کیا گیا۔ امکانات کی تلاش کا کام پھر آغاز کیا گیا۔ نئے شعراء نے ریاضت کو اختیار کیا اور غزل کی جدید تر صورت کو روایت سے پھر منسلک کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس دور کی غزل میں دو غالب رجحان دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف افضال احمد سید، خالد اقبال یاسر، محمد اظہار الحق اور غلام حسین ساجد نے قدیم تہذیبی اور تاریخی سرچشموں سے رجوع کیا اور غزل میں اساطیری حوالے داخل کیے۔

دوسری طرف، شعری روایت کے قدیم سرچشموں سے فیض یاب ہونے کا رجحان سامنے آیا۔ روایت کو زندہ موضوعات کو کامیابی سے بیان کرنے کی خواہش کے زیرِ اثر کھنگالا گیا اور نئے موضوعات اور نئی زندگی کے تجربات کو فنی مہارت اور سچے باطنی تجربے کے حوالے سے بیان کرتی ہوئی غزل سامنے آئی۔ ثروت حسین اور محمد خالد کے ساتھ ساتھ چند گنے چنے شعراء کی غزل ـــ قدیم و جدید روایت کے اس بڑے دھارے کا حصہ بنتی دکھائی دیتی ہے جو اردو غزل کی پوری تاریخ کی غالب اور اعلیٰ اقدار کا دھارا ہے۔ وہ دھارا جسے ہمیشہ رواں دواں رہنا ہے۔ سو یہ سلسلہ آگے کو چل نکلا۔ نئے شعراء میں افضال نوید، اجمل سراج، احمد نوید، لیاقت علی عاصم، ضیاء الحسن اور خالد معین کی غزل اس سلسلے کو آگے بڑھاتی دکھائی دیتی ہے۔ آفتاب حسین اسی قبیلے کا نسبتاً اہم شاعر ہے اور اس نئے لحن کی تشکیل میں اس کی توانا آواز شامل ہے۔

لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اِن شعُراء نے روایت کو اس کی اصل حالت میں قبول
نہیں کیا بلکہ اپنے عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہُوتے اِس میں ترامیم اور اضافے کیے اور یُوں
ایک ایسی غزل سامنے لاتے جس میں عصری صداقتوں کے بیان کے ساتھ ساتھ روایت کا شکوہ بھی
اپنی بھرپُور جھلک دکھاتا ہے۔

ایلیٹ کی بات یاد آتی ہے " جدیدیت بغیر روایت کے ایک بے معنی لفظ ہے اور اگر
کہیں ایسا ادب موجود ہے جو جدید تو ہے لیکن روایت سے اسے کوئی علاقہ نہیں تو میں اسے منسوخ کرتا ہُوں۔"

تمام تر شعری ریاضت کا مقصد ایک طرح کی کامل دسترس کا حصُول ہے جو کامیاب فنّی اظہار
کے لیے ضروری ہُوا کرتی ہے۔ اور ضروری نہیں آپ اسے حاصل بھی کر سکیں لیکن ایک کھرا تخلیق کار اس
کے حصُول کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ آفتاب حسین کی غزل پر غور کریں تو ایک بات فوراً سامنے آتی ہے
اور وُہ ہے اس کی فنّی دسترس۔ لیکن فنّی دسترس مقصود بالذات نہیں ہُوا کرتی۔ لکھنے والا اسے اپنی بات کو
سلیقے سے بیان کرنے کے لیے حاصل کرتا ہے۔ زیادہ اہم یہ ہے کہ لکھنے والے نے بات کیا کی
ہے اور اس بات کو کہنے کے لیے اُس نے اپنی مہارت کو کس طرح اِستعمال کیا ہے۔ ہمارے ہاں
آپ کو کہیں فنّی کمالات کا مظاہرہ کرتی شاعری مِلے گی جس میں موضوعات سطحی اور پھیکے ہوں گے تو
کہیں تخلیقی تجربے کی شدّت، شعر کے کناروں کو توڑتی ہُوتی دکھائی دے گی۔ آفتاب حسین اُن گنے
چُنے شعُراء میں سے ایک ہے جن کے ہاں موضوع اور اظہار کے درمیان ایک خاص طرح کا توازن
دکھائی دیتا ہے۔

اُس کی شاعری پر غور کریں۔ اُس کا بُنیادی مسئلہ تلاش کریں۔
تو ڈور کا سِرا آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ کہیں وُہ اُداس ہے تو کہیں بیزار۔ کہیں وُہ عشق میں مُبتلا دکھائی
دیتا ہے تو کہیں اہلِ عشق سے لاتعلق۔ کہیں اس کے ہاں زندگی کی طرف وارفتگی اور تعلق سے بڑھنے کا
رویّہ دکھائی دیتا ہے تو کہیں مَوت کی وادیاں اُسے بلانے لگتی ہیں۔ کہیں وہ اپنے معروض سے تعلق
محسُوس کرتا ہے تو کہیں مغائرت اور بیگانگی اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور یہی اِس عہد میں ہر
باشعُور جینے والے کا تجربہ ہے۔ آفتاب کا تعلق اُس نسل سے ہے جو معاشی اور معاشرتی زوال کے
اَدوار سے گزری۔ مارشل لائی نظام کی تمام تر سختیوں اور ترقی کے نام نہاد عمل کے پیدا کردہ بحران کی زَد
میں آئی۔ اس نسل نے پُوری شِدّت سے فرد کی نفی کا تجربہ کیا۔ اِسی لیے اپنے دیگر ہم عصروں کی طرح وُہ
بھی واضح ہونا چاہتا ہے، سمت کا تعیّن کرنا چاہتا ہے، اپنے عصر کے سوالات کو سمجھنا اور اُن سے
نبرد آزما ہونا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وُہ مسئلے کے حل کا حِصّہ نہیں بنے گا تو خود مسئلے

کا حصّہ بن جاتے گا۔

وہ بھٹک رہا ہے لیکن یقین کی منزلوں کی جانب رواں دواں ہے۔

بھٹک رہا ہُوں اِدھر اُدھر، اور یہ سوچتا ہُوں
ہزار رستے گماں کے بھی ہیں، یقیں سے پہلے

ہم سے پہلی نسل کے شاعر اُداس تھے، وہ یاد کے سہارے زندگی گزارتے تھے، بے چراغ بستی میں کسی کھوتے ہُوئے کو ڈھونڈا کرتے تھے۔ ان کے پاس چھوڑی ہُوئی جگہوں کی یادیں اور خواب تھے اور انھیں یاد کرنے، اُداس پھرنے کی فرصت دستیاب تھی۔ لیکن ہماری تو زندگی ہی کہیں کھوگئی ہے، اسے کہاں تلاش کیا جاتے ہ؟

سو۔ آفتاب حسین بھی ڈھونڈتا ہے اُس زندگی کو۔ اپنے خارج میں، اپنے داخل میں۔ اپنے خوابوں اور ٹوٹی ہُوئی نیند میں۔ اس کے پاس واحد سہارا اس کی اپنی ذات ہے کہ اس کے علاوہ اس کے سب حوالے مِٹ چکے ہیں یا کمزور پڑ گئے ہیں۔ باہر لاتعلق ہو جاتے تو اندر کے موسم ہی اِنسان کو بامعنی طور پر زندہ رکھ سکتے ہیں۔

انھی سوالات کا سامنا کرتے ہُوتے، کہیں وہ ذات کے صحرا کو پار کرنے لگتا ہے اور کہیں اُسے اپنی رہگزر کسی کے ہاتھوں غبار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ بے ٹھکانہ محسوس کرتا ہے۔

یہ دِل کی راہ چمکتی تھی آئنے کی طرح
گزر گیا وہ اِسے بھی غبار کرتے ہُوتے

کھلا ہُوا ہُوں تیرے شاخچوں پر
اگرچہ مَیں بہار میں نہیں ہُوں

ایسے عالم میں اسے خواب غنیمت لگتے ہیں اور اپنی موجُودگی کا واحد جواز۔

نگاہ کے لیے اِک خواب بھی غنیمت ہے
وُہ تیرگی ہے کہ یہ روشنی غنیمت ہے

خواب کا اِستعارہ ہماری نئی شاعری کا غالب اِستعارہ ہے اور اِس اِستعارے میں معانی کی کتنی پَرتیں چھپی ہُوتی ہیں لیکن آفتاب کے ہاں خواب ایک اور مفہوم میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک ایسا خواب جو وُہ سوتے جاگتے دیکھتا ہے۔ اس میں زندہ رہتا ہے اور اُسے پوری

زندگی پر طاری کرنا چاہتا ہے۔ لیکن یہ خواب اُسے مدار سے باہر لے جاتا ہے اور یہ دُنیا مدار سے باہر نکلنے والوں کو کہاں برداشت کرتی ہے۔ سو اسے سزا ملتی ہے۔

عجیب خواب تھا جس نے مجھے خراب کیا
مِری گرفت میں آ کر نکل گئی دُنیا

نئی شاعری میں خواب کے ساتھ ساتھ۔ نیند، بارش اور موت کا اِستعارہ بھی بڑے تواتر سے سامنے آ رہا ہے۔ خصوصاً موت یا مار دیئے جانے کا خوف غزل اور نظم دونوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ پاسترناک کہتا ہے:

"فن ہمیشہ موت کے بارے میں سوچ بچار کرتا رہتا ہے اور اِس سوچ بچار کے نتیجے میں ہمیشہ زندگی تخلیق کرتا رہتا ہے۔"

آفتاب کی غزل میں بھی موت کا بیان ملتا ہے۔ اس کے ہاں موت ایک اَزلی اَبدی سچائی اور اس سے وابستہ ملال کا اظہار کرتی ہے۔

تو کیا اجل سب حسین منظر اُجاڑ دے گی
یہ پھول چہرے، یہ ماہ پارے نہیں رہیں گے

تُو نے اے دیکھنے والے، کبھی دیکھا ہی نہیں
پھیلتے جاتے ہیں سائے ترے اندر کیا کیا

کفِ درد سے، غمِ کائنات کی گرد سے
وُہی مِٹ رہا ہے جو نقش سا ہے نگاہ میں

وہ موت پر غور کرتا ہے، اس پر ملول ہوتا ہے لیکن اِس ملال سے اُس نے زندگی تخلیق کی ہے۔ اور زندگی کی قوت سے موت کے ہاتھ جھٹکنے کی خواہش کی ہے۔

روشن ہُوں کس اَبد کے اُفق پر میں آفتاب
لرزاں ہے دستِ بادِ فنا میرے سامنے

زندگی اَور موت کے درمیان اِنسانی زندگی ـــــ ماضی، حال اور مستقبل کے زمانوں میں تقسیم ہے لیکن آفتاب حسین کی غزلوں میں وقت۔ اس زمانی تقسیم سے ماورا ایک دھارے

کی صورت رواں دواں ہے۔ وہ اس تقسیم سے اوپر اٹھ کر وقت کے عظیم اور مسلسل بہاؤ میں انسان کی گزران کا نظارہ کرتا ہے اور کائنات کو ایک "کل" کے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں اس نے فلسفیانہ مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ انسان اور کائنات کی حقیقت اور ماہیت کو جاننے کی کوشش بھی کی ہے لیکن اس عظیم فنامنا کو سمجھنے کے لیے اس نے کسی مروج فکری نظام کی بجائے انسان کے باطنی جغرافیے کو حوالہ بنایا ہے۔

کبھی فلک پر کسی ستارے سے جا ملوں گا

مَیں کب تلک یوں پڑا رہوں گا ترتی زمیں پر

لیکن ازلی ابدی اقدار پر توجہ دیتے ہوتے اس نے اپنے گردوپیش سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ کہ کوئی بھی ذمہ دار تخلیق کار اپنے معروض سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے سامنے موجود زندگی کو دیکھتا ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، اس پر رائے زنی کرتا ہے، اس سے پیار کرتا ہے اور اسے جھٹک دیتا ہے۔ وہ دل برداشتہ ہے۔ حالات کا دھارا اسے قدم جمانے نہیں دیتا اور اس کی زندگی بے معنی مصروفیات میں اس قدر جکڑ دی گئی ہے کہ اسے سعیِ گناہ تک کی فرصت نہیں۔

تھی لیکن اس قدر بھی نہ تھی مضطرب حیات

فرصت نہیں کہ کیجیے سعیِ گناہ تک

روز بنیاد اٹھاتا ہوں نئی

روز سیلاب بہا کرلے جاتے

پھر وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ فکرمندی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اور وہ اس صورتِ حال میں تبدیلی کی خواہش کرنے لگتا ہے۔

ہر آدمی کو یہ دنیا بدل کے رکھ دے گی

بدل سکا نہ اگر اب بھی آدمی دنیا

اس کھنڈر پر نئی بنیاد اٹھانا ہے مجھے

آفتاب ایک نیا شہر بسانا ہے مجھے

اور نئے شہر کی تعمیر کی اس خواہش میں مایوسی کہیں نہیں ہے۔ وہ پانیوں کے سینے پر رواں ہے

اور پار اُترنے کی آس رکھتا ہے۔

گرچہ پتوار ٹوٹے ہیں کشتی کے پر آس ٹوٹی نہیں
کوئی جھونکا ہی شاید ہمیں لے چلے ساحلوں کی طرف

اَبتر حالات میں زندگی کرنا، ایک تکلیف دہ تجربہ ہے۔ ہم سب کی طرح آفتاب بھی کمزور ہے۔ اس کا اپنے حالات پر اختیار نہیں۔ اسے انسان سے کم کرکے ایک چیز میں بدل دیا گیا ہے۔ سو وُہ اپنی شبیہ کے رُوبرُو ہے اور اس شبیہ میں وُہ اپنے جیسے دُوسروں کا چہرہ بھی دیکھتا ہے بلکہ اس حوالے سے پُورے عہد کی شبیہ اس کی آنکھوں میں سمٹ آتی ہے جس کے خدوخال، آنسوؤں کے دُھند لکے میں اور بھی BLUR دکھائی دیتے ہیں :

ہمہ وقت اپنی شبیہ کے ہیُوں میں رُو برُو
کوئی اشک ہے کہ یہ آئینہ ہے نگاہ میں

اسے اپنے "ہونے" کے مفہوم کی تلاش کے عمل میں بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، وہ تقدیر کے سامنے بے بس، اور اسے اپنی بے وقعتی کا شدید احساس ہے۔

اپنے ہونے سے یا نہ ہونے سے
فرق پڑتا نہیں سرِ مُو بھی !

پھر مومن کی طرح اس کا دم نارسائی سے رُکنے لگتا ہے۔

میں حرف بن کے ترِی رُوح میں اُتر جاؤں
مِرا سخن تری محفل میں باریاب تو ہو

لیکن اِس نارسائی سے اُس نے اپنی قوّت بھی کشید کی ہے۔ وہ اپنی ذات کے حوالے سے اپنی راہ تشکیل دیتا ہے اور اپنا راستہ خود مُتعیّن کرتا ہے۔ یعنی معاشرے سے بامعنی علیٰحدگی کا راستہ۔ جو دراصل معاشرے ہی کی طرف واپس جاتا ہے۔ یعنی ایک تخلیقی آدمی کا راستہ۔ اُس نے اپنے لیے اس کردار کا انتخاب کیا ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "اچھے وقتوں میں لوگ ہمیں دیوانہ کہتے ہیں اور مشکل وقتوں میں ہماری جانب رہنمائی کے لیے دیکھتے ہیں"۔ سو وُہ علیٰحدگی کی راہ پر چل نکلتا ہے لیکن علیٰحدگی کا یہ راستہ اُسے دُنیا ہی نے دکھایا ہے۔

دُنیا سے علیٰحدگی کا رستہ
دُنیا سے نباہ کرکے دیکھا

اجنبیت، بیگانگی اور علیٰحدگی کا تجربہ بھی ہماری نئی شاعری میں بڑی شِدّت سے سامنے

آیا ہے ۔ اپنے آپ میں گُم ہونے کا احساس، نیند میں چلنے اور باطن میں اُترنے کا تجربہ نئی شاعری میں بار بار ظاہر ہوتا ہے ۔

دم بخود بیٹھا ہُوں میں اپنی فصیلوں میں کہیں
سنسناتی ہیں ہوائیں مِرے باہر کیا کیا

بھٹک رہا ہُوں اپنی وُسعتوں میں
کہیں ، کسی مدار میں نہیں ہُوں

پھر اس لاتعلقی کی دُھند میں وُہ دُنیا کو دیکھتا ہے جو اس کے اِرد گرد ہمہ وقت موجُود ہے ۔ اسے دُنیا سے رابطہ اُستوار کرنے کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اور اِس دنیا میں اپنے کردار کے تعیّن کا سوال پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے ۔

دُوسروں سے بھی رَبط ضَبط رکھیں
زندگی ہے، کوئی جزیرہ نہیں !

بَدل رہے ہیں زمانے کے رنگ کیا کیا دیکھ !
نظر اُٹھا ، کہ یہ دُنیا ہے دیکھنے کے لیے

اور یہیں کہیں وارداتِ عشق اسے زندگی سے جوڑ دیتی ہے ۔ وَیسے بھی شاعر کا راستہ دراصل عِشق ہی کا راستہ ہُوا کرتا ہے ۔ لیکن اس کے ہاں عشق مکمّل سپردگی کا نام نہیں ۔ اگرچہ وہ مَتاعِ دِل و جاں ہارنے پر آمادہ رہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاں ایک خاص قسم کی انا بھی موجُود رہتی ہے جو اسے اِس راہ میں خاک ہو جانے سے روکتی ہے ۔ وہ دراصل عشق کو تکمیلِ ذات کا وسیلہ خیال کرتا ہے اور یہ رویّہ جوہری اعتبار سے "موجُودی" (Existentialist) رویّہ ہے ۔

وُہی ہیں اجنبیّت کی ہوائیں اور وُہی ہم ہیں
وُہی تنہائیاں اپنی، کسی کا ساتھ ہو کر بھی

یہ سوچ کر بھی تو اُس سے نباہ ہو نہ سکا
کسی سے ہو بھی سکا ہے مِرا گزُارہ کہیں

لیکن اس رویّے نے اُسے عشق کی لذت کشید کرنے کی صلاحیت سے محروم نہیں کیا۔ وہ اس ارفع ترین انسانی تجربے کو پوری شدّت اور سچائی سے محسوس کرتا ہے اور بیان کرتا چلا جاتا ہے۔

ترے حوالے سے مَیں زمانے کو دیکھتا ہُوں
تری صباحت کی چھوٹ پڑتی ہے ہر حسیں پر

اِک روشنی کا تار ہے اَور ٹوٹتا نہیں
میرے دلِ خراب سے اُس کی نگاہ تک

یہ گرفتاریِ دل اور اُداسی رُومانیت سے پُھوٹتی رہے۔ اور خاص عُمر کے تجربے کا حُزن اَور خُوبصُورتی اِس میں شامل ہے۔ وُہ اہلِ دل کے قبیلے کا آدمی ہے۔ لیکن ملال کی زَد پر آیا ہُوا یہ قبیلہ۔ اب دُکانِ دل بڑھانے کی بات کرنے لگا ہے کہ اس کے سامنے اقدار اور جذبوں کو پامال کرتے ہُوئے ہنگاموں کی دُھول اُڑ رہی ہے۔

دُکانِ دل بڑھاتے ہیں، حسابِ بیش و کم کر لو
ہمارے نام پر جس جس کا بھی جتنا نکلتا ہے

یوُس ڈِس الوژن ہونے کے علاوہ، وہ یکسانیت اور بے کیفی سے بھی اُکتایا ہُوا ہے۔ وُہ اپنے جذبوں اور خوابوں کی رہنمائی میں دُنیا سے گزرنا چاہتا ہے لیکن اس کے سامنے بے رنگ راستہ ہے اور اُسے وُہ کام کرنے پر مجبُور کر دیا گیا ہے جنھیں وہ کرنا نہیں چاہتا۔

ایک ہی منظر دیکھ رہا ہوں اِس بے انت خرابے میں
ایک ہی صُورت جھانک رہی ہے صَدیوں کی ویرانی سے

مجھ سے ہوتا نہیں جو کام کیے جاتا ہُوں
مجُھ سے بنتی نہیں جو بات بنانا ہے مجُھے

اِن پھیکے، بے کیف شب و روز میں وُہ ماضی کی طرف دیکھتا ہے۔ ماضی۔ جو ظاہر ہو چکا۔ بیت چُکا، اور جسے ہم جانتے ہیں۔ سو وُہ لوٹتا ہے اپنے گزشتہ کی جانب۔ لیکن ہم سب کی طرح آفتاب کا ماضی بھی بے دَر و دیوار ہے۔ اس کا جغرافیہ واضح نہیں۔ یہ ماضی ایسا ہے جس میں چہرے ہیں، محبّتیں ہیں، نفرتیں ہیں اور یادیں۔ اور بیتی ہُوئی عمر کے مہ و سال۔ تلاشِ روزگار

اور حصولِ علم کی خاطر قصبوں اور دیہات سے شہروں کی جانب ہجرت نے ایک کشمکش کو جنم دیا ہے ماضی اُس سے چھپنا نہیں گیا لیکن مناظر تبدیل ہو گئے ہیں، ماضی سے تعلق کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے اور اِس تعلق میں ایک طرح کی لاتعلقی بھی موجود ہے۔ سو آفتاب بھی ان بظاہر بے تعلق چیزوں کو یاد کرتا ہے اور اُس کی نگاہیں اپنی زمین سے لپٹ لپٹ جاتی ہیں۔

قیام کرنے چلا ہوں میں اِک نئی زمیں پر
مگر نگاہیں رُکی ہوتی ہیں یہیں کہیں پر

جب سفر سے لوٹ کر آنے کی تیاری ہُوئی
بے تعلق تھی جو شے وُہ بھی بہت پیاری ہُوئی

پھر ایک گہری اُداسی اُس کے شعروں میں راہ پاتی ہے۔ ایک ایسے مُسافر کی اُداسی جو قافلے کے ساتھ چلتے چلتے کہیں کھو گیا ہے۔ جس کے سامنے منزلیں معدُوم اور راستے گُم ہو چکے ہیں۔ ایک ایسا مُسافر جو سفر کی لاحاصلی کے اِدراک کے باوجُود ترکِ سفر پر آمادہ نہیں۔

اِک زمانہ تھا کہ اِک دُنیا مِرے ہمراہ تھی
اور اب دیکھوں تو رَستہ بھی نگاہوں میں نہیں

خبر تو تھی کہ مآلِ سفر ہے کیا لیکن
خیالِ ترکِ سفر عمر بھر نہیں آیا

لیکن اس دِل شکن صُورتِ حال میں بھی۔ آفتاب نے اپنے دِل کی لَو کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ اپنی ذات کو مٹنے نہیں دیا۔ اُس کی انفرادیت کا ایک پہلو اُس کی انانیت بھی ہے۔ اس کی غزلوں میں انکار اور غُصّہ موجُود ہے۔ اور دَبی دَبی بغاوت جسے ہم "مابعدالطبیعیاتی بغاوت" (Metaphysical Rebelion) کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

میں تیری درگاہ پر جبینِ نیاز رکھ دوں
مگر وہ انکار، جو لکھا ہے مِری جبیں پر

وہ اندر سے مضبُوط اور بہادر آدمی ہے لیکن ایک مہذّب اِنسان کی طرح اپنی بے خوفی سے ڈر بھی جاتا ہے۔

خُود اپنے ہاتھ کی ہیبت سے کانپ جاتا ہُوں
کبھی کبھی کسی دُشمن پہ وار کرتے ہُوتے

کہیں کہیں اُس نے اپنے موضوع کو نبھانے کے لیے خالص روایتی انداز کا سہارا بھی لیا ہے اور قدیم زبان کی چاشنی سے پُرانے کلاسیکی شعُرا کی یاد دلاتی ہے لیکن یہاں بھی اُس کی انفرادیت صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

عمرِ رفتہ کے نشاں ڈُھونڈتا ہُوں
آپ کو کوئی پتا ہو صاحب
تُم کہ نفرت کی نظر دیکھتے ہو
اے تمھارا بھی بھلا ہو صاحب

اس کی شاعری میں ابلاغ مسئلہ نہیں بنتا۔ اس کے شعر کی ایک پَرت فوراً کُھل جاتی ہے، لیکن اس کے اشعار میں پہلُو دار معنویت موجُود ہے۔ وہ ایک خاص معیار سے نیچے نہیں اُترتا پھر ایک قابلِ غور بات یہ ہے کہ اُس کی غزل ظاہری سج دھج والی اور معرُوضی پیمانوں پر پُوری اُترنے والی غزل ہے۔ اِن معنوں میں یہ رَوایتی غزل ہے۔ ہمارے اکثر غزل گو شعُرا کا موضُوع بھی روایتی ہوتا ہے۔ یا پھر وہ اسے روایتی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ غیر روایتی موضُوعات کو اِس روایتی صنفِ سخن میں بیان کرنے کے لیے خاصی محنت اور صلاحیّت درکار ہوتی ہے۔ اور خیر سے ہمارے اکثر لکھنے والے اِس صلاحیّت سے محرُوم ہیں۔ آفتاب کے موضُوعات جدید ہیں، اس کے ہاں نئے اِنسان کے مَسائل ہیں۔ ایک پُرشور زندگی ہے اور اُس زندگی کے عین وَسط میں ہر طرف سے یلغار کی زَد پر آئی ہُوئی اُس کی ذات ہے۔ پھر اُس کے ذاتی تجربے میں مُنہ زوری ہے۔ اُس کے معروض میں ردھم نہیں۔ اس کا تجربہ مصرعوں کا تجربہ نہیں اور اُس کے سامنے کے منظر کو تلازمے کے ذریعے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اُس نے ایسے "نان کنفارمسٹ" مواد کو ایک نہایت "کنفارمسٹ" صنف میں بڑی کامیابی اور چابکدستی سے بیان کر کے دکھا دیا ہے اور اِس معاملے میں اُس کی غزل اپنے معاصرین میں سے صِرف افضال نوید کی غزل سے مماثلت رکھتی ہے۔

ہنری مِلر لکھتا ہے:

"Madame, there are always two paths to take: one back towards the comforts and security of Death, the other forward to no-where___"

آفتاب حسین نے "Forward to nowhere" والا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ راستہ جو کہیں نہیں جاتا۔ چنانچہ ہر طرف جاتا ہے۔ یہ راستہ زندگی کا راستہ ہے جس کی منزلوں کا تعیّن نہیں کیا جا سکتا۔ موت کی مخالف سمت کو جاتا ہُوا، زندگی کا یہ راستہ۔ جس میں وُسعتیں ہیں، تنگیاں ہیں، تنہائیاں ہیں، انکار ہے، اذیّت ہے، لڑائی ہے، ملال اور محبت ہے اور زندگی ہے۔ اُس نے "سیدھی راہ" پر چلنے کی تن آسانی پر غیر مفاہمانہ طرزِ زندگی کی اذیت کو ترجیح دی ہے۔ اُس نے ایک ایسے مُسلسل سفر، مُسلسل خواب میں چلنے کا راستہ اپنایا ہے، جس کی سرحدیں وقت کے اَزلی اَبدی پھیلاؤ میں کہیں جا کر مدغم ہو جاتی ہیں۔ اُس نے اپنے موضوعات کو محدُود نہیں کیا اور اپنی Options کھُلی رکھی ہیں۔ اِسی لیے اُس کے ہاں موضُوعاتی اِرتفاع اور رنگا رنگی دکھائی دیتی ہے۔ وُہ فوری صُورتِ حال کا شاعر نہیں بلکہ نظر آنے والے مظاہر اور ان سے پَرے چیزوں کی اصل ماہیت اور اُن کی حقیقت تک رَسائی کی کوشش سے اُس کی شاعری بھری پڑی ہے۔

مَیں اپنی آنکھ کے روزن سے دیکھ سکتا ہُوں
وُہ پھُول بھی، جو ابھی شاخ پر نہیں آیا

شاعر کو یہ تو پتہ ہونا ہی چاہیے کہ اُسے کیا کہنا ہے اَور کیسے کہنا ہے۔ لیکن یہ بات شاید زیادہ اہم ہے کہ وُہ یہ بھی جانتا ہو کہ اُسے کیا اَور کیسے نہیں کہنا۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے پاس روایت کا گہرا شعور ہو اَور اپنی ہی خلق کردہ چیز کو رد کرنے کی ہمّت بھی ہو۔ آفتاب نے ریاضت، سنجیدگی اور سخت چناؤ کے راستے کو اختیار کیا ہے۔ پھر اس کے پاس تنقیدی بصیرت بھی موجُود ہے جو اُسے بُرا شعر کہنے سے باز رکھتی ہے۔

آفتاب حسین کی شاعری کے فنّی محاسن کا بیان ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔ اور کم از کم میرے لیے یہ بات اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ مَیں تو اِتنا جانتا ہُوں کہ اس کے اشعار میں جان ہے، اثر ہے، اس کے اشعار مجھے اپنی جگہ پر نہیں رہنے دیتے۔ میرے اندر کوئی چیز تبدیل ہو جاتی ہے اور میرا دِل ایک لطیف سے احساس سے بھر جاتا ہے۔ جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ ایک اچھے شعر سے اور کیا مطالبہ کیا جا سکتا ہے؟

اس کے اشعار میں یہ اثر انگیزی کیوں ہے۔ میں نے اِس بات پر بھی غور کیا ہے۔ ہم عام طور پر کسی فن پارے کو پرکھنے کے لیے مختلف پیمانے اِستعمال کرتے ہیں۔ اس میں مختلف تکنیکی لوازم کی موجُودگی کو تلاش کرتے ہیں۔ معاشرتی، نفسیاتی و دیگر محرکات کا تذکرہ

کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات ہوتی ہے۔ اِنفرادی خُوشبُو۔ جسے آپ بیان نہیں کر سکتے۔ بس محسُوس کر سکتے ہیں۔ اور یہ خُوشبُو صرف اس شخص کی تخلیقات سے برآمد ہوتی ہے جو تخلیقی طور پر مُنفرد ہو۔ جس کا تجربہ مُنفرد اور طاقت وَر ہو اور جس کے کہنے کا انداز مُنفرد ہو۔ گویا لفظوں کا ایک مفہوم لفظوں سے ماورا بھی ہوتا ہے۔ یہی اِنفرادی خُوشبُو آفتاب حسین کے شعر میں اثر انگیزی پیدا کرتی ہے۔ اور اُس کے شعر کو اُس کا شعر بناتی ہے۔

آفتاب نے اپنی واردات کو باطنی سطح پر زندہ رکھا ہے اور اِس واردات کے خدوخال کو اپنی تخلیقات میں چابکدستی اور خُوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اور یوں اُس نے "عمومیت" دینے کی خواہش کے زیرِ اثر کہیں اپنے تجربے کو باطنی سچائی کی روشنی سے محروم نہیں ہونے دیا۔ اس کے اشعار میں سادگی ہے، پُرکاری ہے، مصرعوں کی ترشی ہُوئی شکلیں ہیں، تلازمہ کاری ہے، شگفتگی اور برجستگی ہے۔ اُس نے نہایت سادگی سے ایسے رَواں دَواں اشعار تخلیق کیے ہیں جنھیں تادیر یاد رکھا اور خُود کلامی کے انداز میں دُہرایا جا سکتا ہے۔

کسے معلوم، کہاں، کون، کسے
اپنے رستے پہ لگا کر لے جائے

کیا کیا بات نہ بن سکتی تھی
لیکن اب کیا ہو سکتا ہے

کسی کے اِنتظار میں نہیں ہُوں
نشے میں ہُوں، خُمار میں نہیں ہُوں

پھُول سے اُڑ گئی ہے خُوشبُو بھی
کاش یہ بات سوچتا تُو بھی

رات اس حُسنِ دلآرام کی چھب تھی کوئی
تُو نے دیکھی نہیں کل رات غضب تھی کوئی

احساسِ ذِمّہ داری فکر و فن کی بُنیاد ہے۔ ہمارے ہاں جس طرح بھگدڑ مچی ہُوئی ہے۔ اس میں بہت کم لکھنے والے اَیسے ہیں جو فوری ترغیبات کے جال میں نہیں آتے۔ ان کے نزدیک اَدب

دائمی اقدار سے وابستہ ہے اور فوری طور پر اگر اس سے کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے تو وُہ محض تخلیقی لُطف اور ذاتی کتھارسس ہے۔ ہمارے ہاں شہرت کے حصُول کا ایک نیا طریقہ یہ نکالا گیا ہے کہ رنگ برنگی، ظاہری شان و شوکت والی کتابوں کی ایک قطار لگا دی جائے۔ چلنتر قسم کی شاعری سے انھیں بھر دیا جائے۔ اور سیل ویلیو بڑھانے کے لیے ان پر سَستے جذبات کو اُبھارنے والے ٹائیٹل چسپاں کر دیے جائیں۔ یہ نُسخہ کامیاب بھی ہے اور اب تو ہمارے خاصے سینیئر اور مُعتبر لکھنے والے بھی اِس دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک طرف اَدب کے قاری کے ذوق کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے تو دُوسری طرف خُود شعراء کے کرام تن آسانی کی راہ پر چل نکلے ہیں۔ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا کہ وُہ رُکیں اور اپنی تخلیق یا طرزِ عمل پر غور کریں۔ اِس طریقِ کار میں بہت سی تسلیاں اور وَقتی خُوشیاں تو موجُود ہیں لیکن آخری تجزیے میں اِس قسم کی شاعری کہاں کھڑی ہوگی، اس کا کچھ اندازہ ان لکھنے والوں کو بھی ضرُور ہو گا۔

آفتاب حسین اس جال سے بچ نکلا ہے۔ اُس نے کوئی شارٹ کٹ لگانے کی کوشش نہیں کی۔ وُہ اَدب کی اَدبی اَور اخلاقی اقدار سے آگاہ ہے۔ وہ اپنے تخلیقی تجربے کو اپنے اندر تھام کر رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اِنتظار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں آپ کو رُوا رَوی کے اشعار یا غزلیں نہیں ملتیں۔ آپ اُس کے اشعار سے ایسے ہی نہیں گزر سکتے آپ کو رُکنا پڑتا ہے، غور کرنا پڑتا ہے اور داد دینا پڑتی ہے۔ جتنے اچھے اور قابلِ ذکر اشعار اس کی اِس پہلی کتاب سے بر آمد ہُوتے ہیں، وُہ اچھے بھلے نامی گرامی شعُراء کے پُورے کام سے بھی کم کم نکلتے ہیں۔

یہ آفتاب حسین کا پہلا مجمُوعہ ہے اور پہلے مجمُوعۂ کلام سے عام طور پر زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جاتیں۔ ہمارے اکثر شعُراء خُود بھی اپنے پہلے مجمُوعے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ آفتاب خُود کہتا ہے۔

میں کیا کہوں کہ ابھی کوئی پیش رفت نہیں
گُزر رہا ہُوں ابھی رہگزر بناتے ہُوئے

لیکن اِس کتاب کا مُطالعہ گواہ ہے کہ اس نے اپنی ایک رہگزر بنا ڈالی ہے۔ یہ کتاب اپنے ساتھ ایک سنجیدہ، بالغ نظر، پُختہ کار اور اہم شاعر کی خبر لاتی ہے اور جدید تر اُردُو غزل میں اُس کے نمایاں مقام کا اعلان کرتی دِکھائی دیتی ہے۔

وُہ رواں دَواں ہے، آگے چلے گا اور مزید حیران کرے گا۔

ابرار احمد

فصیلِ شہرِ تمنّا میں دَر بناتے ہُوئے
یہ کون دِل میں دَر آیا ہے گھر بناتے ہُوئے

نشیبِ چشمِ تماشا بنا گیا مجھ کو
کہیں بلندیِ ایّام پر بناتے ہُوئے

مَیں کیا کہوں کہ ابھی کوئی پیش رفت نہیں
گزر رہا ہُوں ابھی رہ گزر بناتے ہُوئے

کسے خبر ہے کہ کتنے نجوم ٹُوٹ گرے
شبِ سیاہ سے رَنگِ سحر بناتے ہُوئے

پتے کی بات بھی مُنہ سے نِکل ہی جاتی ہے
کبھی کبھی کوئی جھُوٹی خبر بناتے ہُوئے

مگر یہ دِل مرا، یہ طائرِ بہشت مرا
اُتر ہی آیا کہیں، مُستقر بناتے ہُوئے

دِلوں کے باب میں کیا دخل آفتاب حسین
سو بات پھیل گئی مختصر بناتے ہُوئے

مقامِ شوق سے آگے بھی اِک رستہ نکلتا ہے
کہیں کیا سِلسلہ دِل کا کہاں پر جا نکلتا ہے

مِژہ تک آتا جاتا ہے بَدن کا سب لہُو کھِنچ کر
کبھی کیا اِس طرح بھی یاد کا کانٹا نکلتا ہے

دُکانِ دل بڑھاتے ہیں، حسابِ بیش و کم کرلو!
ہمارے نام پر جِس جِس کا بھی جِتنا نکلتا ہے

ابھی ہے حُسن میں حُسنِ نظر کی کارفرمائی
ابھی سے کیا بتائیں ہم کہ وہ کیسا نکلتا ہے

میانِ شہر ہیں یا آئنوں کے رُو برُو ہیں ہم
جسے بھی دیکھتے ہیں کچھ ہمیں جیسا نکلتا ہے

یہ دِل کیوں ڈُوب جاتا ہے، اُسی سے پُوچھ لُوں گا ئیں
ستارہ شامِ ہجراں کا اِدھر بھی آ نکلتا ہے

دِلِ مُضطر! وفا کے باب میں یہ جلد بازی کیا
ذرا رُک جائیں اور دیکھیں، نیتجہ کیا نکلتا ہے

کبھی جو راستہ ہموار کرنے لگتا ہُوں
کچھ اَور بھی اُسے دُشوار کرنے لگتا ہُوں

مرے وجُود کے اندر بھڑکنے لگتا ہے
جب اُس چراغ کا انکار کرنے لگتا ہُوں

نظر میں لاتا ہُوں اُس چشمِ نیم باز کو مَیں
اور اپنے آپ کو بیمار کرنے لگتا ہُوں

جہاں بھی کوئی ذرا ہنس کے بات کرتا ہے
میں اپنے زخم نمُودار کرنے لگتا ہوں

وہ شور ہوتا ہے خوابوں میں آفتاب حسین
کہ خُود کو نیند سے بیدار کرنے لگتا ہوں

اُسی طرح کے شب و روز ہیں، وہی دُنیا
پرانی خاک پہ تعمیر ہے نئی دُنیا

مَیں اپنے آپ میں گُم تھا، مجُھے خبر نہ ہُوئی
گزُر رہی تھی مجُھے رَوندتی ہُوئی دُنیا

ہر آدمی کو یہ دُنیا بدل کے رکھ دے گی
بدل سکا نہ اگر اب بھی آدمی، دُنیا

نئی ہوا کو مدد کے لیے پکارتی ہے
خود اپنی آگ میں جلتی ہوئی نئی دُنیا

میں جس حوالے سے دُنیا پہ غور کرتا ہوں
اُسی طرح سے کبھی، کاش سوچتی دُنیا

میں اپنے اصل کی جانب رواں دواں ہوں اور
بُلا رہی ہے مسلسل مجھے مری دُنیا

عجیب خواب تھا جس نے مجھے خراب کیا
مری گرفت میں آ کر نکل گئی دُنیا

گئے منظروں سے یہ کیا اُڑا ہے نگاہ میں
کوئی عکس ہے کہ غبار سا ہے نگاہ میں

ہمہ وَقت اپنی شبیہ کے ہُوں مَیں رُو برُو
کوئی اشک ہے کہ یہ آئینہ ہے نگاہ میں

کوئی شہرِ خواب گزُر رہا ہے خیال سے
کوئی دشتِ شام سُلگ رہا ہے نگاہ میں

کفِ دردسے غمِ کائنات کی گرد سے
وُہی مٹ رہا ہے جو نقش سا ہے نگاہ میں

کوئی تیرگی ہے فراتِ جاں میں رواں دواں
مگر اک چراغ سا تیرتا ہے نگاہ میں

گئے موسموں کی وہ سبز رنگ حکایتیں
کوئی آبِ سُرخ سے لکھ گیا ہے نگاہ میں

ہر پھول ہے ہواؤں کے رُخ پر کھلا ہُوا
اَور مَیں ہُوں اپنے خواب کے اندر کھِلا ہُوا

یہ مَیں جو رات دِن نہیں اپنے حواس میں
وہ باغ ہے ضرُور کہیں پر کھِلا ہُوا

کچھ میرے سَر کو بھی تھی مہک سی چڑھی ہُوئی
کچھ وہ بھی سامنے تھا برابر کھِلا ہُوا

خوابوں میں خوشبوئیں سی، خیالوں میں رنگ سے
یہ باغ ہو اگر کہیں باہر کھِلا ہُوا

کِن منظروں میں مجھ کو دہکنا تھا آفتاب
کِس ریگ زار پر ہوں میں آ کر کھِلا ہُوا

Scanned by CamScanner

پھول سے اُڑ گئی ہے خوشبو بھی
کاش یہ بات سوچتا تُو بھی

اپنے ہونے سے یا نہ ہونے سے
فرق پڑتا نہیں سرِ مُو بھی

خوشبوئیں پھیلتی نظر آئیں
اُس نے کھولے نہیں ہیں گیسو بھی

لوگ کیا کیا نہ تیرے بعد ملے
نہ چلا پھر کسی کا جادُو بھی

حَبس ہے اَور ہی طرح کا اِدھر
چلتی رہتی ہَے کچُھ نہ کچُھ لُو بھی

ساتھ ہونا، قریب ہونا نہیں
جل بُجھے کچھ شجر لبِ جُو بھی

کیسا موسم ہے، آفتاب حسین
خُشک ہونے لگے ہیں آنسو بھی

یہ جبر بھی ہے بہت اِختیار کرتے ہُوئے
گزُر رہی ہے تِرا اِنتظار کرتے ہُوئے

کلی کِھلی تو اُسی خوِش سخن کی یاد آئی
صَبا بھی اب کے چلی سوگوار کرتے ہوئے

تِرے بدن کے گلستاں کی یاد آتی ہے
خُود اپنی ذات کے صحرا کو پار کرتے ہُوئے

یہ دِل کی راہ چمکتی تھی آئینے کی طرح
گزر گیا وہ اِسے بھی غبار کرتے ہُوئے

خُود اپنے ہاتھ کی ہیبت سے کانپ جاتا ہو
کبھی کبھی کسی دُشمن پہ وار کرتے ہُوتے

Scanned by CamScanner

کسی کے اِنتظار میں نہیں ہُوں
نشے میں ہُوں، خمار میں نہیں ہوں

کِھلا ہُوا ہُوں تیرے شانچوں پر
اگرچہ مَیں بہار میں نہیں ہُوں

کسی کے ہاتھ کس طرح سے آؤں
مَیں اپنے اِختیار میں نہیں ہُوں

بھٹک رہا ہُوں اپنی وُسعتوں میں
کہیں، کسی مدار میں نہیں ہُوں

شکار ہو گیا ہُوں خُود کِسی کا
مَیں اَب کسی شکار میں نہیں ہُوں

نگاہ میں ہُوں آفتاب اپنی
نگاہِ کِردگار میں نہیں ہُوں

تمھارے بعد رہا کیا ہے دیکھنے کے لیے
اگرچہ ایک زمانہ ہے دیکھنے کے لیے

کوئی نہیں جو ذرا تے نظر بھی دیکھ سکے
ہر ایک نے اُسے دیکھا ہے دیکھنے کے لیے

بدل رہے ہیں زمانے کے رنگ کیا کیا، دیکھ
نظر اُٹھا، کہ یہ دُنیا ہے دیکھنے کے لیے

ذرا جو فُرصتِ نظّارگی میسّر ہو !
تو ایک پَل میں بھی کیا کیا ہے دیکھنے کے لیے

گزُر رہا ہے جو چہرے پہ ہاتھ رکھے ہوئے
یہ دل اِسی کو ترستا ہے دیکھنے کے لیے

نہیں ہے تابِ نظارہ ہی آفتاب حسین
وگرنہ دہر میں کیا کیا ہے دیکھنے کے لیے

رات اُس حُسنِ دلآرام کی چھب تھی کوئی
تُم نے دیکھی نہیں کل رات غضب تھی کوئی

دِل کا یہ حال ہُوا تب کہیں احوال کھُلا
اَشکِ خُونیں کا سبب سُرخیِ لب تھی کوئی

بُجھتے بُجھتے بھی رُکے جاتے تھے پل پل روشن
یہ بھی اِک بات ستاروں میں عجب تھی کوئی

بے طلب گھومتے رہنے نے دکھائے کیا دِن
یاد بھی اب نہیں آتا کہ طلب تھی کوئی

کسی پہلو نہ دلِ زار کو آرام آیا
زندگی تھی کہ تِرے ہجر کی شب تھی کوئی

مٹ گیا دل مگر اب تک ہے وہی چھب دل کی
اِس خرابے میں بھی تعمیر عجب تھی کوئی

Scanned by CamScanner

شبِ سیاہ پہ وا روشنی کا باب تو ہو
مگر یہ شرط ہے کوئی ستارہ یاب تو ہو

مَیں حرف بن کے تری رُوح میں اُتر جاؤں
مرا سخن تری محفل میں باریاب تو ہو

سوادِ شب کے سفر میں ستارہ وار چلوں
ترے جمال کی لَو میری ہم رکاب تو ہو

کسی طرح تو گھٹے دِل کی بے قراری بھی!
چلو وہ چشم نہیں، کم سے کم شَراب تو ہو

اَساسِ جسم اُٹھاؤں نئے سرے سے، مگر
یہ سوچتا ہُوں کہ مٹی مِری خراب تو ہو

وہ آفتاب لَبِ بام بھی اُتر آتے
مگر کِسی میں اُسے دیکھنے کی تاب تو ہو

کام کیا آئیں گے اُس آنکھ کے تیور خالی
ہم بھی اب دینے لگے وار برابر خالی

کرم اِتنا بھی نہ اَے ساقیِ دَوراں فرما
دِل وہ پیمانہ کہ ہوتا ہے جو بھر کر خالی

کھلبلی وہ ہے کہ پھر آج دِل و جان کے بیچ
کام موقوف ہُوئے جاتے ہیں ، دفتر خالی

دِن نکلتا ہے تو جی مار کے پڑ رہتا ہُوں
رات آتی ہے تو ہو جاتا ہے بستر خالی

دِل پہ کیا کیا نہ مسرّت کے زمانے آتے
دَولتِ دَرد سے ہوتا نہیں یہ گھر خالی

Scanned by CamScanner

یہ دَوڑ دُھوپ ہے جتنی بھی، جستجو نہ سمجھ
جو رات آنکھ سے ٹپکا اُسے لہُو نہ سمجھ

نگارِ صُبح دکھاتی ہے دیکھنا ! کیا رنگ
ابھی سے چشمِ تمنّا کو سُرخرو نہ سمجھ

سمجھ سکا ہے کہاں دِل کے مسئلے کوئی
سمجھ سکے بھی تو اِن مسئلوں کو تُو نہ سمجھ

ہر اِک کو اپنی محبّت کی داستاں نہ سُنا
دِلوں کی بات کو محفل کی گفتگو نہ سمجھ

دُکانِ دہر میں اب دِل کو کون پُوچھتا ہے
نہ تازگی، نہ سلیقہ، نہ گفتگو، نہ سمجھ

Scanned by CamScanner

دیکھے کوئی تعلّقِ خاطر کے رنگ بھی
اُس فِتنہ خُو سے پیار بھی ہے اَور جنگ بھی

دِل ہی نہیں ہے اُس کے تصوّر میں شادکام
اِک سَرخُوشی میں جھومتا ہے انگ انگ بھی

کُچھ ربطِ خاص اصل کا ظاہر کے ساتھ ہے
خُوشبُو اُڑے تو اُڑتا ہے پھُولوں کا رنگ بھی

ایسا نہیں کہ آٹھ پہر بے دِلی رہے
بجتے ہیں غم کدے میں کبھی جلترنگ بھی

دیکھا ہے آج اُس نے مجھے مُڑ کے آفتاب
اِس واقعے پہ خُوش بھی ہُوں مَیں اَور دنگ بھی

اپنے آپ کو دیکھ رہا ہُوں حیرانی حیرانی سے
ورنہ اَور تعلق کیا ہے میرا بہتے پانی سے

ایک ذرا سی بات تھی لیکن طرح طرح کے پیچ پڑے
کتنے کام آسان ہُوتے ہیں اَور کتنی آسانی سے

رات بہت دِن بعد آتے ہیں دِل کے ٹکڑے آنکھوں میں
رات بہت دن بعد ملے ہیں یہ انگارے پانی سے

کب تک اپنا آپ سنبھالیں، کب تک ضبط کی خُو ڈالیں
دِل کی بات نکل جاتی ہے آنکھوں کی نادانی سے

ایک ہی منظر دیکھ رہا ہُوں اس بے اَنت خرابے میں
ایک ہی صُورت جھانک رہی ہے صَدیوں کی ویرانی سے

ہم نے بھی ہر چند بھرا ہے سوانگ اس کھیل تماشے میں
ربط نہیں کھُلتا اپنا کچھ اِس بے رَبط کہانی سے

کمی رکھتا ہوں اپنے کام کی تکمیل میں
مبادا آپ کھو جاؤں کہیں تمثیل میں

بہت شِدّت رہی پہلے کنارِ چشم تک
اُمڈ آیا ہے اب وہ سیل رُودِ نیل میں

مکانِ جاں لرزتا ہے ہوائے ہجر سے
چراغِ یاد کو رکھیں گے کِس قندیل میں

یہ گھڑیاں، آہ یہ مجھ سے گریزاں ہیں اگر
تو پھر مَیں کیوں رہوں گا وقت کی تحویل میں

عذابِ برق و باراں تھا، اندھیری رات تھی
رواں تھیں کشتیاں کس شان سے اُس جھیل میں

تنہائی ، سکوت ، ہَوا ، پانی
وہی رات، وہی گہرا پانی

آکاش پہ چاند ہے پُورے کا
اور نیچے ساگر کا پانی

اِس خواب بھری حیرانی میں
کیا کہتا ہے گونگا پانی

مَیں تجھ کو آنکھوں میں بھر لوں
تُو مجھ کو گلے لگا پانی

کبھی اندر اُترو تو دیکھو
اِس خاک میں ہے کِتنا پانی

لہروں کی صُورت بہتا ہے
بادل کی طرح اُڑتا پانی

اِک جانب مَنُح بستہ آتش
اَور ایک طرف جلتا پانی

جانے کب دَریا میں اُترے
یہ میرے اندر کا پانی

اپنا دیوانہ بنا کر لے جائے
کبھی وہ آئے اور آ کر لے جائے

روز بُنیاد اُٹھاتا ہُوں نئی
روز سیلاب بہا کر لے جائے

حُسن والوں میں کوئی ایسا ہو
جو مجھے مجھ سے چُرا کر لے جائے

رنگِ رُخسار پہ اِتراؤ نہیں !
جانے کب وقت اُڑا کر لے جائے

کِسے معلوم ، کہاں ، کون ، کِسے
اپنے رستے پہ لگا کر لے جائے

آفتاب ! ایک تو ایسا ہو کہیں
جو ہمیں اپنا بنا کر لے جائے

کہاں کسی پہ یہ احسان کرنے والا ہُوں
مَیں اپنے آپ کو حیران کرنے والا ہُوں

عجیب رنگ کی خُوشبُو ہے میرے کِیسے میں
مَیں شہر بھر کو پریشان کرنے والا ہُوں

کِھلا رہے گا کبھی یاد کے جزیرے پر
یہ باغ، مَیں جسے وِیران کرنے والا ہُوں

دُعائیں مانگتا ہوں سب کی زندگی کے لیے
اور اپنی مَوت کا سامان کرنے والا ہوں

کچھ اَور طرح کی مشکل میں ڈالنے کے لیے
مَیں اپنی زندگی آسان کرنے والا ہوں

جب سفر سے لوٹ کر آنے کی تیّاری ہُوئی
بے تعلّق تھی جو شے وہ بھی بہُت پیاری ہُوئی

چار سانسیں تھیں مگر سینے کو بوجھل کر گئیں
دو قدم کی یہ مسافت کِس قدر بھاری ہُوئی

ایک منظر ہے کہ آنکھوں سے سرکتا ہی نہیں
ایک ساعت ہے کہ ساری عمر پر طاری ہُوئی

اِس طرح چالیس بدلتا ہُوں بساطِ دہر پر
جیت لُوں گا جس طرح یہ زندگی ہاری ہُوئی

کِن طلسمی راستوں میں عُمر کاٹی آفتاب
جس قدر آساں لگا، اُتنی ہی دُشواری ہُوئی

قیام کرنے چلا ہُوں مَیں اِک نئی زمیں پر
مگر نگاہیں رُکی ہُوئی ہیں یہیں کہیں پر

نہ بادباں کی مَوافقت میں ہوا رَواں ہے
نہ وہ ستارہ ہی ضَو فشاں بحرِ نیلمیں پر

ترے حوالے سے مَیں زمانے کو دیکھتا ہُوں
تری صباحت کی چھُوٹ پڑتی ہے ہر حَسیں پر

کھُلا کہ اِک دائرے میں کاٹی ہے عُمر میں نے
چلا جہاں سے تھا لَوٹ کر آ گیا وہیں پر

مَیں تیری دَرگاہ پر جبینِ نیاز رکھ دُوں
مگر وہ اِنکار، جو لکھا ہے مِری جبیں پر

کبھی فلک پر کسی ستارے سے جا مِلوں گا
میں کب تلک یُوں پڑا رہُوں گا تِری زمیں پر

وجُود کا اِنحصار گو خاک پر نہیں تھا
مگر مَیں اپنی زَمین سے بے خبر نہیں تھا

عجب طرح کا طلسم تھا اُس مفارقت میں
بدن لرزتا تھا اَور آنکھوں میں ڈر نہیں تھا

لہُو سے مَیں نے دِیے کی لَو سَرفراز رکھی
وہاں، جہاں پر ہَواؤں کا بھی گزُر نہیں تھا

مگر بہت دیر بعد جا کر خبر ہوئی تھی
وہ میرے ہم راہ تھا، مرا ہم سفر نہیں تھا

سو میں نے آخر لرزتا پتّا ہدف بنایا
کہ وہ پرندہ تو آج بھی شاخ پر نہیں تھا

جو ناگوار ہے سب کچھ، گوارا کرتے ہُوئے
گزُر رہا ہُوں یہاں سے گزُارہ کرتے ہُوئے

وہ اپنی لہر میں ہے اَور مَیں اپنی موج میں ہُوں
اور اُس کے ساتھ ہُوں اُس سے کنارہ کرتے ہُوئے

خیال میں رہے خوابوں کی بے لباسی بھی!
ہمارے چاکِ گریباں کا چارہ کرتے ہُوئے

نہ بات کہنے کی مُہلت ہے اور نہ سُننے کی
چلے چلو یُونہی ایک آدھ اشارہ کرتے ہُوئے

وہ روشنی کے بھنور ہیں کہ آفتاب حسین
نظر ٹھہرتی نہیں ہے نظارہ کرتے ہُوئے

چیخ اُٹھو کہ کراہو صاحب
دِل دیا ہے تو نبا ہو صاحب

کچھ اُسے فرق نہیں پڑنے کا
تُم اُسے چاہو، نہ چاہو صاحب

ہم تو اُس شوخ کے ہو بیٹھے ہیں
اَور کیا اِس سے سوا ہو صاحب

پُوجنے والے کو کچھ فرق نہیں
کوئی بُت ہو کہ خُدا ہو صاحب

تُم کہ نفرت کی نظر دیکھتے ہو
اے، تمھارا بھی بھلا ہو صاحب

عُمرِ رفتہ کے نشاں ڈھونڈتا ہوں
آپ کو کوئی پتا ہو صاحب

موت کے درد کا درماں معلوم
زندگانی کی دَوا ہو صاحب

ذرا سی دیر کو چمکا تھا وہ ستارہ کہیں
ٹھہر گیا ہے نظر میں وُہی نظارہ کہیں

کہیں کو کھینچ رہی ہے کشش زمانے کی
بُلا رہا ہے تری آنکھ کا اِشارہ کہیں

یہ لہر بہر جو ملتی ہے ہر طرف دل میں
بدل گیا ہی نہ ہو زندگی کا دَھارا کہیں

یہ سوچ کر بھی تو اُس سے نباہ ہو نہ سکا
کسی سے ہو بھی سکا ہے مِرا گزارہ کہیں!

رَواں دَواں رہو! ہر چند آفتاب حسین
دکھائی دیتا نہیں دُور تک کنارہ کہیں

قدم قدم پہ کسی اِمتحاں کی زَد میں ہے
زمین اَب بھی کہیں آسماں کی زَد میں ہے

ہر ایک گام اُلجھتا ہُوں اپنے آپ سے مَیں
وہ تیر ہُوں جو خُود اپنی کماں کی زَد میں ہے

وہ بحر ہُوں جو خُود اپنے کنارے چاٹتا ہے
وہ لہر ہُوں کہ جو سَیلِ رَواں کی زَد میں ہے

میں اپنی ذات پہ اصرار کر رہا ہوں مگر
یقیں کا کھیل مسلسل گماں کی زد میں ہے

مرے وجود کے اندر اُترتا جاتا ہے
ہے کوئی زہر جو میری زباں کی زد میں ہے

لگی ہوئی ہے نظر آنے والے منظر پر
مگر یہ دل کہ ابھی رفتگاں کی زد میں ہے

یہی نہیں کہ فقط رزق خواب بند ہوا
گدائے کوئے ہنر بھی سگاں کی زد میں ہے

اُفق اُفق جو مرے نور کا غبار اُڑا
یہ کائنات مرے خاکداں کی زد میں ہے

رُوحوں کی خاموشی میں آواز لگاتے رہا کرو
زندہ ہو تو ہونے کا احساس دلاتے رہا کرو

جو بھی سچّی بات کہے گا ، زہر لگے گا دُنیا کو
اپنے سچ میں تھوڑا تھوڑا جھوٹ ملاتے رہا کرو

شہر میں گرچہ گرد بہت ہے، دُھواں بہت ہے، لیکن تم
آنکھوں کے جھلمل پردوں پر خواب سجاتے رہا کرو

آنکھ سے اوجھل ہونے والے دِل سے ہو جاتے ہیں دُور
پیار اگر قائم رکھنا ہے، آتے جاتے رہا کرو

اِسی طرح سے کھیل کھیل میں سارے دن کٹ جائیں گے
مَیں بے چَین سا پھِرا کروں گا، تم یاد آتے رہا کرو

Scanned by CamScanner

خُوشبُو کی طرح دِل میں بسا کر اُسے دیکھو
لوگوں کی نگاہوں سے چھُپا کر اُسے دیکھو

شاید وہ سُلگ اُٹھّا ہو یادوں کی ہوا سے
فرصت ہو کسی روز تو جا کر اُسے دیکھو

کیا جانیں وہ فردوسِ نظر کب نظر آئے
تصویر ہی اب اُس کی اُٹھا کر اُسے دیکھو

پتھّر سا نظر آتا ہے وہ موم کا پیکر
اب آئے تو سینے سے لگا کر اُسے دیکھو

کہتے ہو کہ یاد اُس کی وبالِ دل و جاں ہے
ایسا ہی اگر ہے تو بھُلا کر اُسے دیکھو

برہم ہی نظر آتا ہے ہر بات پہ وہ شوخ
یہ تازہ غزل آج سُنا کر اُسے دیکھو

وہ سر سے پانو تک ہے غضب سے بھرا ہُوا
مَیں بھی ہُوں آج جوشِ طلب سے بھَرا ہُوا

شورش مِرے دماغ میں بھی کوئی کم نہیں
یہ شہر بھی ہے شور و شغب سے بھَرا ہُوا

ہاں اے ہَوائے ہجر، ہمیں کچھ خبر نہیں
یہ شیشۂ نشاط ہے جب سے بھَرا ہُوا

ملتا ہے آدمی ہی مجھے ہر مقام پر
اَور مَیں ہُوں آدمی کی طلب سے بھرا ہُوا

ٹکراؤ جا کے صُبح کے ساغر سے آفتاب!
دِل کا یہ جام وعدۂ شب سے بھرا ہُوا

مرے یقیں کو پسِ پردۂ گماں کر کے
تُو اِس نواح میں رہتا ہے پر کہاں کر کے

نہیں ہے کوئی بھی اِس انجمن میں ہم جیسا
چراغ جل تو رہے ہیں مگر دُھواں کر کے

گزُر گئے ہیں وہ لمحے رَوا رَوی میں اگر
گزُار دو یہ زمانے بھی رائیگاں کر کے

مَیں اپنے خُون کا دریا بنا تو تُوں لیکن
ٹھہر نہ جائے یہ کشتی مجھے رَواں کر کے

یہ کون تھا کہ ہَدف بن کے سامنے آیا
پلٹ گیا ہے مگر تیر کو کماں کر کے

نگاہ کے لیے اک خواب بھی غنیمت ہے
وہ تیرگی ہے کہ یہ روشنی غنیمت ہے

چلو کہیں پہ تعلّق کی کوئی شکل تو ہو
کسی کے دل میں کسی کی کمی غنیمت ہے

کم و زیادہ پہ اصرار کیا کیا جائے
ہمارے دَور میں اِتنی سی بھی غنیمت ہے

بدل رہے ہیں زمانے کے رنگ کیا کیا دیکھ!
نظر اُٹھا، کہ یہ نظّارگی غنیمت ہے

نجانے وقت کی گردش دکھائے گی کیا رُخ
گزُر رہی ہے جو یہ زندگی، غنیمت ہے

غمِ جہاں کے جھمیلوں میں آفتاب حسین
خیالِ یار کی آسُودگی غنیمت ہے

بس ایک بات کی اُس کو خبر ضرُوری ہے
کہ وہ ہمارے لیے کس قدر ضرُوری ہے

دِلوں میں دَرد کی دَولت بچا بچا کے رکھو
یہ وہ متاع ہے جو عُمر بھر ضرُوری ہے

نہیں ضرُور کہ مقدُور ہو تو ساتھ رکھیں
کبھی کبھار مگر نوحہ گر ضرُوری ہے

کبھی تو کھیل پرندے بھی ہار جاتے ہیں
ہوا کہیں کی بھی ہو، مستقر ضروری ہے

یہ کیا ضرور کہ مست اپنے آپ ہی میں رہیں
اِدھر اُدھر کی بھی کچھ کچھ خبر ضروری ہے

مفر نہیں غمِ دُنیا سے آفتاب حسین
بہت کٹھن ہے یہ منزل مگر ضروری ہے

Scanned by CamScanner

دلِ حزیں ہمارے ہاتھ اگر ترِی کمند ہو
تو پھر فصیلِ حُسن بھی نہ اِس قدر بلند ہو

اَب اِس قدر بھی بے ثباتِ زندگی ہُوئی نہیں
دُکانِ دہر سے ہمیں کوئی تو شے پسند ہو

کسے خبر کہ عشق کی مسافتوں کے درمیاں
زمیں سے لے کر آسماں تک ایک ہی زقند ہو

غم میں نہ ہو کہ اِس سفر کی منزلیں عجیب ہیں
ہزار راستے کھُلیں جو ایک راہ بند ہو

مَیں ایک اِک کِرن کو آفتاب اُسی پہ وار دُوں
مِرے نواح میں اگر وہ ماہِ ارجمند ہو

اُجڑتی سرزمیں پر پھر کئی منظر اُتر آئے بہاروں کے
کہ دشتِ جاں میں چلنے لگ گئے ہیں قافلے ناقہ سواروں کے

ہمارے دل میں بھی شاید کبھی کچھ صورتیں آباد ہوتی تھیں
ابھی تک اِس جگہ آثار ملتے ہیں کئی اُجڑے دیاروں کے

سمجھتے تھے کہ اِن سمتوں سے ہی تیری سواری کا گزر ہوگا
اِسی اُمیّد پر ہم لوگ پتھّر ہو گئے ہیں رہ گزاروں کے

کبھی تو ریگ زارِ شب میں وہ خُورشید رُو بھی رُونما ہو گا
کبھی تو اے شبِ غم! طور بدلیں گے ترے اختر شماروں کے

ہمارے ہاں تو جو مٹی میں ملتا ہے گل و گلزار ہوتا ہے
ہمارے ہاں تو زندوں سے بہت اچھّے مُقدّر ہیں مزاروں کے

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبّتوں کی کتاب لکھنا
بہت کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پہ داستانِ گلاب لکھنا

میں جب چلوں گا تو ریگزاروں میں اُلفتوں کے کنول کِھلیں گے
ہزار تم میرے راستوں میں محبّتوں کے سراب لکھنا

فراق موسم کی چلمنوں سے وصال لمحے چمک اُٹھیں گے
اُداس شاموں میں کاغذِ دل پہ گُزرے وَقتوں کے باب لکھنا

وہ میری خواہش کی لَوحِ تشنہ پہ زندگی کے سَوال اُبھرنا
وہ اُس کا حَرفِ کرم سے اپنے قبُولیت کے جواب لکھنا

گئے زمانوں کی دَرد کجلائی بھُولی بسری کتاب پڑھ کر
جو ہو سکے تم سے آنے والے دِنوں کے رنگین خواب لکھنا

دَرد کے راہی، غموں کی رہ گزُر، تنہائیاں
رات کا لمبا سفر اور ہم سَفر تنہائیاں

دِن کا سُورج شام کی آغوش میں ڈُوبا ہی تھا
بَین کرنے لگ گئیں دِل کے نگر، تنہائیاں

آسماں سے میرے آنگن کو سفر کرتی رہیں
چاند کی کِرنوں کی صُورت رات بھر تنہائیاں

زندگی بھر کی مسافت کاٹ کر بھی کیا مِلا
اجنبی دیوار و دَر، سنسان گھر، تنہائیاں

کشتِ زارِ زندگی میں ہم نے جب بھی آفتاب
محفلوں کے بیج بوتے تو ثمر تنہائیاں

غم کی لَے پر تھرک رہی ہے رات
کن خیالوں میں جھومتی ہے رات

مشعلِ ماہتاب تھامے ہوئے
رات بھر کس کو ڈھونڈتی ہے رات

سوچتے سوچتے ہوئی ہے صبح
جاگتے جاگتے کٹی ہے رات

لمحہ لمحہ سُلگ رہا ہُوں میں
قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے رات

لمحہ لمحہ سُلگ رہا ہُوں میں
اور مِرے ساتھ جل رہی ہے رات

کون آیا ہے دِل کے جنگل میں
کس کی خُوشبُو سے کِھل اُٹھی ہے رات

اے گُلِ ماہتاب! تُو ہی بتا
کِس کی فُرقت میں شبنمی ہے رات

کاٹتے کاٹتے کٹے گی کہیں
آج یہ جو پہاڑ سی ہے رات

کسی طرح بھی تو وہ راہ پر نہیں آیا
ہمارے کام ہمارا ہُنر نہیں آیا

وہ یوں مِلا تھا کہ جیسے کبھی نہ بچھڑے گا
وہ یوں گیا کہ کبھی لَوٹ کر نہیں آیا

ہم آپ اپنا مقدّر سنْوار لیتے مگر
ہمارے ہاتھ کفِ کوزہ گر نہیں آیا

خبر تو تھی کہ مآلِ سفر ہے کیا لیکن
خیالِ ترکِ سفر عُمر بھر نہیں آیا

میں اپنی آنکھ کے روزن سے دیکھ سکتا ہُوں
وُہ پھُول بھی، جو ابھی شاخ پر نہیں آیا

ابھی دِلوں کی طنابوں میں سختیاں ہیں بہت
ابھی ہماری دُعا میں اثر نہیں آیا

باغی ہوئی ہے ہم سے تو اپنی سپاہ تک
ملتی نہیں ہے خانۂ دل میں پناہ تک

وہ بادِ تیز ہے کہ کہاں شعلۂ غمیں
نایاب ہو گیا ہے یہاں دودِ آہ تک

تھی، لیکن اس قدر بھی نہ تھی مضطرب حیات
فرصت نہیں کہ کیجیے سعیِ گناہ تک

دُنیا کی چھتر چھانو سکوں بخش ہے، تو ہو
اِس دِل کی دَوڑ دُھوپ ہے بس تیری راہ تک

اِک روشنی کا تار ہے اور ٹوٹتا نہیں
میرے دِلِ خراب سے اُس کی نگاہ تک

اَفرا تفری تھی ایسی جلدی میں
ہوگئی دیر جلدی جلدی میں

دو گھڑی چین سے بسر کرتے
اِتنی مُہلت کہاں تھی جلدی میں

خیر ہم تو ہیں جلد باز بہت
آپ ہیں کِس طرح کی جلدی میں

ہیں سبھی اپنی اپنی دُھن میں رَواں
ہیں سبھی اپنی اپنی جلدی میں

کام سارا بگاڑ بیٹھا ہُوں
آفتاب! اِک ذراسی جلدی میں

منزل ہاتھ نہیں آپاتی ، خواب ادھورا رہ جاتا ہے
راہِ طلب پر چلتے چلتے آدمی آدھا رہ جاتا ہے

کبھی کبھی تو دِل کی دھڑکن بند بھی ہو جاتی ہے صاحب
کبھی کبھی تو سینے میں بس درد دھڑکتا رہ جاتا ہے

تُجھ کو بھُول چُکے ہیں ہم بھی ، لیکن ایسی بات نہیں کچھ
سُورج ڈُوب بھی جائے اگر تو ایک دُھندلکا رہ جاتا ہے

چلنے والے چلتے چلتے اپنی منزل پا لیتے ہیں
راہ دکھانے والا بُوڑھا راہ دکھاتا رہ جاتا ہے

وقت کا پہیّا چلے تو پھر کب چل سکتا ہے زور کسی کا
آدمی اپنے آپ کو کیا کیا چیز سمجھتا رہ جاتا ہے

جب کوئی آئنہ بھی نہ تھا میرے سامنے
اِک مَیں تھا، ایک میرا خُدا میرے سامنے

تیرا وجُود اَور پسِ پَردۂ نگاہ
میرا ہے تُو اگر تو پھر آ میرے سامنے

دیکھو تو ریگ زارِ تمنّا کی وُسعتیں
بِکھری ہُوئی ہے میری صَدا میرے سامنے

اِک عکس تھا کہ دِل کی تہوں میں اُتر گیا
اِک رنگ تھا کہ پھیل گیا میرے سامنے

روشن ہُوں کِس اَبد کے اُفق پر مَیں آفتاب
لرزاں ہے دَستِ بادِ فنا میرے سامنے

معنی کی زد میں ہوں، کبھی لفظوں کی مار پر
کٹتے ہیں صُبح و شام یُونہی تیز دھار پر

اِک بات پر ٹکے تو کوئی بات بھی بنے
کب اعتبار اِس دلِ بے اعتبار پر

ممکن ہے اُس کی راہ میں میری گلی پڑے
جلتا رہوں گا بامِ شبِ انتظار پر

مَیں ہی رہینِ گردشِ کون و مکاں نہیں
دیکھو اگر تو کچھ بھی نہیں ہے قرار پر

یہ دشتِ بے جہات، یہ شب ہائے نامُراد
ہم لوگ چل رہے ہیں کسی کی پُکار پر

دِل شام ہی سے ڈُوب گیا اپنا آفتاب
سیّارے گھُومتے رہے اپنے مَدار پر

راس آ گئی نظر کو جو آب و ہوائے خواب
اب رتجگوں میں بھی ہمیں اکثر دکھائے خواب

تعبیر کی اِک اشرفی کشکولِ چشم میں
مانگے گا تجھ سے اور بھلا کیا گدائے خواب

کیا جانیں روشنی کا مسافر کب آئے گا
کب سے ہے منتظر کوئی اُجڑی سرائے خواب

اِک عُمر محوِ آئنہ بندی رہی نظر
پھر چند سبز ساعتیں ٹھہریں بہائے خواب

دیکھو! دریدہ دامنِ شاعر میں کیا نہیں
یہ ہے متاعِ یاد تو یہ گنج ہائے خواب

Scanned by CamScanner

خواب کی رُت سے تعبیر کے سبزرُو موسموں کی طرف
رہ نشاں تک تو آ پہنچے آؤ چلیں منزلوں کی طرف

وہ جو ہم سے بچھڑ کر ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہیں
ساربانو! چلو کچھ قدم اور اُن راستوں کی طرف

گرچہ پتوار ٹوٹے ہیں کشتی کے، پر آس ٹوٹی نہیں
کوئی جھونکا ہی شاید ہمیں لے چلے ساحلوں کی طرف

وہم کے جنگلوں کا نوالا ہوئے، سوچ کے قافلے
لمحۂ صد گماں سے چلے تھے یقیں ساعتوں کی طرف

طائرانِ شبِ غم سویرے کے دِیدار کو عمر بھر
خواہشوں کے جزیروں سے اُڑتے رہے حسرتوں کی طرف

Scanned by CamScanner

دِل بھی آپ کو بھُول چکا ہے
صاحب! آپ سے کیا پَردہ ہے

کہنے سُننے کی باتیں ہَیں
کون کِسے اپنا سکتا ہے

عِشق میں کیا سچّا، کیا جھُوٹا
یہ تو عُمروں کا رونا ہے

حال ہمارا پُوچھنے والے
کیا بَتلائیں! سب اچّھا ہے

کیا کیا بات نہ بن سکتی تھی
لیکن اب کیا ہو سکتا ہے

اَب بھی دِل کے دروازے پر
ایک دِیا جلتا رہتا ہے

کب تک ساتھ نبھاتا آخر
وہ بھی دُنیا میں رہتا ہے

دنیا پر کیوں دوش دَھریں ہم
اپنا دل بھی کب اپنا ہے

یاد یہ کس کی آ گئی گردشِ روزگار میں
کس نے سکون بھر دیا پھر دلِ بے قرار میں

ابرِ کرم اُٹھا اُدھر، ڈھ گئے گھر کے گھر اِدھر
قہر بھی تھا مِلا ہُوا رحمتِ کردگار میں

کتنے چراغ جل اُٹھے صُبحِ سفر کے آس پاس
کتنے شجر ہرے ہُوئے جاتی ہُوئی بہار میں

خلوتیانِ ذی شرف اُس کی نظر سے گِر گئے
جلوتیانِ خاکسار آپ ہیں کِس شمار میں!

رات دلِ خراب میں پھر تری یاد آگئی
آگ بھڑک بھڑک اُٹھی پھر کسی بَرف زار میں

مَیں سوچتا ہُوں اگر اِس طرف وُہ آجاتا
چراغِ عُمر کی لَو اِک ذرا بڑھا جاتا

"عجیب بھُول بھُلیّاں ہے راستہ دِل کا"
یہاں تو خضر بھی ہوتا تو ڈگمگا جاتا

سوا اپنے ہاتھ سے دِیں بھی گیا ہے دُنیا بھی
کہ اِک سرے کو پکڑتے تو دُوسرا جاتا

مگر نہیں ہے وہ مصروفِ ناز اِتنا بھی
کبھی کبھی تو کوئی رابطہ کیا جاتا

کبھی وہ پاس بُلاتا تو یہ دلِ درویش
بس اِک اِشارہ ابرُو پہ جھُومتا جاتا

پلٹ رہا ہُوں اُسی یارِ مہرباں کی طرف
اَب اِس قدر بھی نہیں بے وَفا ہُوا جاتا

پلٹ گیا اُنھیں قدموں سے آفتابِ حسین
کہاں تلک وہی حالات دیکھتا جاتا

کِسی نے دی تھی دَرِ خواب پر کبھی دستک
لَرز رہی ہے مِری چشمِ آرزُو اَب تک

یہ کس دیارِ طَرب خیز سے گزُرتا ہُوں
مشامِ جاں میں اُترتی ہے زندگی کی مہک

ہزار طرح کے مہمان دِل میں ٹھہرے ہیں
مگر وہ دَردِ محبّت کی اوّلیں دستک!

سوادِ شامِ غریبی کو قطع کرتے رہو!
نظر پڑے گی کہیں پرتوِ صبحِ نَو کی جھلک

بس اِک قدم کی مُسافت تھی آفتاب حسینؔ
نشیبِ خاک سے افلاک کی بلندی تک

گزرِ اوقات ہوتی ہے کہیں خوابوں میں کھو کر بھی
بہت گھڑیاں گزاری ہیں اگرچہ ہم نے سو کر بھی

وہی ہیں اجنبیّت کی ہوائیں اور وہی ہم ہیں
وہی تنہائیاں اپنی، کسی کا ساتھ ہو کر بھی

اور اب ہموار دھرتی پر سنبھل کر پاؤں دھرتے ہیں
بہت ہوتی ہے ساری زندگی میں ایک ٹھوکر بھی

یہ دریا ہے اِسے ہر حال میں بہتے ہی رہنا ہے
رَوانی ہے وہی لہروں میں، کشتی کو ڈبو کر بھی

جو تُو چاہے تو بس اِک آن میں بازی اُلٹ جائے
ترے زیرِ تصرّف ہیں سبھی، پتّے بھی، جوکر بھی

دُھوپ جب ڈھل گئی تو سایہ نہیں
یہ تعلق تو کوئی رِشتہ نہیں

لوگ کِس کِس طرح سے زِندہ ہیں
ہمیں مرنے کا بھی سلیقہ نہیں

سوچیے تو ہزار پہلو ہیں
دیکھیے ! بات اِتنی سادہ نہیں

Scanned by CamScanner

خواب بھی اِس طرف نہیں آتے
اِس مکاں میں کوئی دَریچہ نہیں

چلو مر کر کہیں ٹھکانے لگیں
ہم کہ جن کا کوئی ٹھکانا نہیں

مَنزلیں بھی نہیں مُقدّر میں
اَور پلٹنا ہمیں گوارا نہیں

دُوسروں سے بھی رَبط ضبط رکھیں
زندگی ہے، کوئی جزیرہ نہیں

کب بھٹک جائے آفتاب حسین
آدمی کا کوئی بھروسا نہیں

اصلِ حالت کا بیاں ظاہر کے سانچوں میں نہیں
بات جو دِل میں ہے میرے میرے لفظوں میں نہیں

اِک زمانہ تھا کہ اِک دُنیا مِرے ہم راہ تھی
اور اب دیکھوں تو رستہ بھی نگاہوں میں نہیں

کوئی آسیبِ بلا ہے شہر پر چھایا ہُوا
بُوئے آدم زاد تک خالی مکانوں میں نہیں

رفتہ رفتہ سب ہماری راہ پر آتے گئے
بات ہے جو ہم بُروں میں، اچھّے اچھّوں میں نہیں

اپنے ہی دم سے چراغاں ہے وگرنہ آفتاب
اِک ستارہ بھی مِری وِیران شاموں میں نہیں

بکھرتا حرف ہوں، خوش رنگ سی تصویر ہو جاؤں
کبھی اے کاش اُس کے ہاتھ سے تحریر ہو جاؤں

اُڑوں تو خوف، خوں بن کر رگوں میں سرسراتا ہے
نہ جانے مَیں کہاں پر، کس گھڑی زنجیر ہو جاؤں

خُود اپنے نام کا اظہار تک کرنے سے ڈرتا ہوں
مبادا مَیں کسی کے ہاتھ سے تسخیر ہو جاؤں

بگڑتا ہی چلا جاتا ہوں میں اَور یہ سمجھتا ہوں
کہ شاید اِس عمل میں پھر کہیں تعمیر ہو جاؤں

زمانے کے وَرق پر ایک مُبہم سی عبارت ہوں
خبر کیا کل کلاں کِس رنگ سے تفسیر ہو جاؤں

اِس اندھیرے میں جو تھوڑی روشنی موجود ہے
دِل میں اُس کی یاد شاید آج بھی موجود ہے

وقت کی وحشی ہوا کیا کیا اُڑا کر لے گئی
یہ بھی کیا کم ہے کہ کچھُ اُس کی کمی موجود ہے

کون جانے آنے والے پل میں یہ بھی ہو، نہ ہو
دُھوپ کے ہم راہ یہ جو چھاؤں سی موجود ہے

کہ مِل چکا ہُوں کہیں پہ اُس مہ جبیں سے پہلے
وہ جب ملے گا تو بات ہو گی یہیں سے پہلے

بھٹک رہا ہُوں اِدھر اُدھر اور یہ سوچتا ہُوں
ہزار رستے گُماں کے بھی ہیں یقیں سے پہلے

اِسی توقّع پہ اُس سے اصرار کر رہا ہُوں
کہ اُس نے اقرار بھی کیا تھا، نہیں سے پہلے

کرتا کچھ اَور ہے وہ دکھاتا کچھ اَور ہے
دراصل سِلسلہ پسِ پَردہ کچھ اَور ہے

ہردم تغیّرات کی زَد میں ہے کائنات
دیکھیں پلک جَھپک کے تو نقشہ کچھ اَور ہے

جو کچھ نگاہ میں ہے حقیقت میں وہ نہیں
جو تیرے سامنے ہے تماشا، کچھ اَور ہے

رکھ وادیِ جنوں میں قدم پھُونک پھُونک کر
اے بے خبر سنبھل! کہ یہ رستہ کچُھ اَور ہے

تحریر اَور کچُھ ہے سرِ متنِ زندگی
اَور حاشیے میں ہے جو حوالہ، کچُھ اَور ہے

ہر چند دِل دھڑکتا ہے پَل پَل، گھڑی گھڑی
لیکن جو آج دِل کو ہے دھڑکا، کچُھ اَور ہے

اِتنی بھی احتیاط نہ کر جانِ آفتاب
خدشے کچُھ اور ہوتے ہیں، ہوتا کچُھ اَور ہے

گھڑی گھڑی اِسے روکو، گھڑی گھڑی سمجھاؤ
مگر یہ دِل ہے کہ کچھ دیکھتا ہے آؤ نہ تاؤ

عجب طرح کے جھمیلے ہیں عِشق میں صبا!
برت سکو تو ہو معلوم آٹے دال کا بھاؤ

اب اُس کے درد کو دِل میں لیے تڑپتے ہو!
کہا تھا کِس نے کہ اُس خُوش نظر سے آنکھ ملاؤ

چلو وہ اگلا سا جوش و خروش تو نہ رہا
مگر یہ کیا کہ ہلو اور ہاتھ بھی نہ ہلاؤ

نظر ہے شرط حقیقت کو دیکھنے کے لیے
کہ ہر بگاڑ میں ہوتے ہیں سو طرح کے بناؤ

ہمارے حال کا کیا ہے، سُدھر ہی جائے گا
مگر یہ بات کہ تم اپنی اُلجھی لٹ سُلجھاؤ

ہماری عُمر بھی گزُری ہے اِس خرابے میں
کہاں کے ہوتے ہیں یہ لوگ اہلِ عشق، ہٹاؤ

کبھی کھُلو بھی یہ کیا ہے کہ آفتاب حسین!
پڑے رہو یُونہی گھر پر، کِسی کے آؤ نہ جاؤ

Scanned by CamScanner

اَب بجتے ہیں کیا رباب اور چنگ
دل دَرد سے ہو گیا ہم آہنگ

ہَستی سے نباہ چاہتا ہُوں
مَرنے کے تو ہیں عجب عجب ڈھنگ

کیا وقت کے ساتھ ہم قدم ہوں
ہر آن بدل رہا ہے آہنگ

دُنیا کا بھی زور دیکھ لیں گے
فی الحال ہے اپنے آپ سے جنگ

اِک دل ہی کا خُوں نہیں ہُوا کچُھ
دیکھو، دِکھلاتے آنکھ کیا رنگ

کچُھ خُود سے بھی تنگ ہُوں مَیں اَور کچُھ
یہ شہر بھی مجُھ پہ ہو گیا تنگ

دیکھے اگر آنکھ بھر کے کوئی!
دِل بھی ہے مثالِ نقشِ اَرژنگ

آباد رہے یہ شہرِ لاہور
مَیں بھُول نہیں سکا تلہ گنگ

Scanned by CamScanner

ہم عشق بھی گاہ کر کے دیکھا
اللہ پناہ! کر کے دیکھا

اُس شوخ کو دیکھنے گئے تھے
حسرت سے، اِک آہ کر کے دیکھا

آنکھوں کا نہیں ہے ٹھیک کوتی
سو دِل کو گواہ کر کے دیکھا

ق

وہ چشم نہ ہو سکی ہماری
ہرچند نباہ کر کے دیکھا

تعمیر ہُوئی نہ دِل کی دُنیا
خُود کو بھی تباہ کر کے دیکھا

وہ کام کہ تھا رنپٹ خرابی
وہ کام بھی گاہ کر کے دیکھا

دُنیا سے علیحدگی کا رستہ
دُنیا سے نباہ کر کے دیکھا

گرمیِ عشق نے پگھلائے ہیں پتھّر کیا کیا
دیکھتے دیکھتے بدلے ہیں یہ منظر کیا کیا

دم بخود بیٹھا ہوں میں اپنی فصیلوں میں کہیں
سنسناتی ہیں ہوائیں مرے باہر کیا کیا

رخِ روشن سے شبِ تار کا پردہ نہ ہٹا
خون میں ڈوب گئے مہرِ منوّر کیسا کیا

تُو نے اے دیکھنے والے! کبھی دیکھا ہی نہیں
پھیلتے جاتے ہیں سائے ترے اندر کیا کیا

کتنے سیلابِ بلا آنکھ سے ہو کر گزُرے
اَور نشاں چھوڑ گئے وادیِ دِل پر کیا کیا

ہم تو ہیں مثلِ پرِ کاہ، ہمارا کیا ہے
ڈُوبتے جاتے ہیں دریا میں شناور کیا کیا

آفتاب اپنے تصرّف میں نہیں ہیں ہم لوگ
لوگ احساس دلا جاتے ہیں آکر کیا کیا

اگر تری آنکھ کے اشارے نہیں رہیں گے
فلک پہ یہ نیلگوں ستارے نہیں رہیں گے

کہیں، کسی گھاٹ تو لگے گی یہ دِل کی کشتی
کہ عُمر بھر ہم بھی مارے مارے نہیں رہیں گے

یہ چار دن ہیں جو آج کل، عافیت کے دِن ہیں
اُٹھا جو طوفان تو کنارے نہیں رہیں گے

یہ حُسن جو کچھ ہے، دیکھنے والی آنکھ تک ہے
نگاہ بدلی تو یہ نظارے نہیں رہیں گے

تو کیا اجل سب حسین منظر اُجاڑ دے گی
یہ پھول چہرے، یہ ماہ پارے نہیں رہیں گے

اِس کھنڈر پر نئی بُنیاد اُٹھانا ہے مجھے
آفتاب! ایک نیا شہر بسانا ہے مجھے

ڈھونڈتا رہتا ہوں ہر سمت مَفر کی راہیں
اَور ہر راہ بھٹکنے کا بہانہ ہے مجھے

اک مرا دل ہے کہ قابُو میں نہیں ہے میرے
اَور اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ہے مجھے

مجھ سے ہوتا نہیں جو کام، کِیے جاتا ہُوں
مجھ سے بنتی نہیں جو بات، بنانا ہے مجھے

مَیں جو اِس کارِ شب و روز سے کتراتا ہُوں
مجھے معلُوم ہے سب چھوڑ کے جانا ہے مجھے

میرے گمان میں.....

جون ایلیا

گزشتہ ہزاروں شاموں کی طرح آج کی شام بھی میری زندگی کی ایک حزن آور شام ہے۔ شام کا ذکر آیا تو میں اپنے بارے میں ایک بات بتا دوں کہ میری زندگی کا کوئی بھی دن کبھی شروع نہیں ہوا، بس ختم ہوا۔ اگر کوئی جنا مجھ سے یہ پوچھے کہ میاں! تیرے ہونے اور ہوتے رہنا کا آخر کیا مطلب ہے؟ تو میں یہ جواب دوں گا کہ ایک لگاتار جہنمی شام۔ یہاں مجھے اپنا ایک فارسی شعر یاد آ گیا ہے۔

نشاطِ نفسِ آرامشِ سراچہ شام ~ میرس قصۂ شامِ دمِ جہنمِ من

میری آج کی شام گزشتہ کئی مہینوں کی حزن آور شاموں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی حزن آور شام ہے۔ اِس شہر کا ماحول کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ زندگی ہے کہ مسلسل خفقان ہو کر رہ گئی ہے، اِس وقت کچھ ایسا ہی ہے کہ جیسے دِل ڈوبا جا رہا ہو۔ اِن لمحوں میں جو شعر میری دُسرات کر رہا ہے، وُہ یہ ہے ~

یہ دِل کیوں ڈُوب جاتا ہے اُسی سے پُوچھ لوں گا ~ ستارہ شامِ ہجراں کا اِدھر بھی آنکلتا ہے

اِس وقت بیس اِکیس غزلوں کا ایک مسوّدہ میرے سامنے ہے۔ یہ مسوّدہ آفتاب حسین نامی ایک شاعر کا ہے۔ اِس مسوّدے کا ایک اَور شعر بھی میرے باطنِ باطن اور کامنِ کامن سے ایک عجیب حال انگیز معاملت کر رہا ہے ~

کوئی شہرِ خواب گزر رہا ہے خیال سے ~ کوئی دشتِ شام سلگ رہا ہے نگاہ میں

مجھے "دشتِ شام" سے زندانِ شام کا خیال آ گیا ہے۔ نہ جانے کیوں، نہ جانے کِس بنا پر۔ اور میرے سینے میں ایک مرثیے کا شعر جو میں نے لڑکپن میں سُنا تھا گریہ کرنے لگا ہے۔ ~

جب گُل ہوا چراغِ حرم ملکِ شام میں ~ سکینہ مر گئی زندانِ شام میں

میرے ذہن میں جو بات آتی جائے گی وُہ میں کہتا جاؤں گا۔ مجھ سے کسی مربُوط اور مرتّب نگارش کی توقع نہ رکھی جائے۔ مَیں نے آفتاب حسین کا نام پہلی بار پرسوں اپنے قوّتِ بازو انیق احمد سے سُنا۔ اب یا تو یہ میری شوریدہ بختی ہے یا آفتاب حسین کی! گمانِ ذوق، بلکہ، گمانِ غالب، یہ ہے کہ یہ میری ہی شوریدہ بختی ہے اور وُہ یوں کہ میں اپنے وجُودِ وجُود میں خُود اپنی شوریدہ بختی ہُوں*۔ انیق احمدِ دل دار و پُرآزار نے آفتاب حسین کی غزلوں کا مسوّدہ مجھے دیا ہے۔ اس کا مطالعہ میں نے ایک ہی نشست میں کر ڈالا۔ یہ بات شاید اس طرح کہی جانی چاہیے کہ میں نے اِس مسودے کو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالنے پر اپنے آپ کو تقریباً مجبور پایا۔ یہاں مجھے اپنی نوجوانی کے زمانے کا ایک فارسی شعر یاد آ رہا ہے "یاد باد آں روزگاں یاد باد"

گل دستہ ہائے رنگ شنیدن ضرور نیست ~ مجموعہ ہائے زخم نہ خواندن نہ می تواں

اِس وقت میرے ذہن میں آفتاب حسین کی ذات سے متعلق قیاس آرائی کرنے کا ایک محرمانہ رُجحان نمُو پا رہا ہے۔ میرے قیاس کے مطابق وہ نسبتاً نقوی، زیدی، جعفری..... یا مُوسوی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے میرا یہ قیاس یکسر بے اَساس ہو۔ لیکن یہ بات 'شاید' یقینی ہے کہ (یہاں 'شاید' کا لفظ شاید قابلِ داد ہے) وُہ امامی ہیں۔

؎ کوئی تیرگی ہے فراتِ جاں میں رواں دواں — مگر اک چراغ سا تیرتا ہے نگاہ میں
نہیں ضرور کہ مقدور ہو تو ساتھ رکھیں — کبھی کبھار مگر نوحہ گر ضروری ہے

اس پر مجھے نیم اُردو شاعر غالب کا ایک شعر یاد آ گیا۔

؎ حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں — مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو مَیں

وہ ایک بھی "ماورا النہری" ہونے کے باوجود امامی تھا۔ آفتاب حسین کے دو اور شعر سُنیے ؎

ہم تو ہیں مثلِ پرِ کاہ، ہمارا کیا ہے — ڈوبتے جاتے ہیں دریا میں شناور کیا کیا
رُخِ روشن سے شبِ تار کا پردہ نہ ہٹا — خون میں ڈوب گئے مہرِ منوّر کیا کیا

پہلے شعر کا دُوسرا مصرع اور علیٰ ھذا القیاس دُوسرے شعر کا دُوسرا مصرع کیا آپ کو میر انیس، میر مونس، مرزا دبیر اور مرزا اَوج کے 'سلاموں' کی یاد نہیں دلاتا؟ اب اگر میرا قیاس بھی یعنی آفتاب حسین کا امامی ہونا بے اساس ہے تو مَیں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "آفتاب حسین" ایسے غلط فہمی میں مبتلا کرنے والے نام رکھنا کوئی مناسب بات ہرگز نہیں۔

اب مَیں اپنی قیاس آرائی کی حالت میں ان کی ذات فہمی کے سفر کے سلسلے کو آگے بڑھاتا ہُوں۔ میرا خیال ہے کہ آفتاب حسین متوسط قامت اور گندمی رنگ کے ۳۱، ۳۲ سالہ جوان ہوں گے اور ان کے بال لمبے لمبے اور جھبرے نہیں ہوں گے اور یہ کہ اگر حکومت یہ حکم نامہ جاری کر دے کہ اِس شخص کو دیکھتے ہی گرفتار کر لیا جائے جو اپنی وضع قطع اور حُلیے کے اعتبار سے شاعر دکھائی دیتا ہو تو آفتاب حسین اس حکمنامے کی زد میں ہرگز نہ آئیں گے۔ اِن شاء اللہ۔ یہاں 'شاعر' سے میری مُراد جگر صاحب، مجاز، میراجی، نیاز حیدر، ساغر صدیقی اور جون ایلیا ہیں۔ مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وُہ ایک نستعلیق قسم کے صاحبِ دل متنفس ہوں گے اور انھیں اپنی نستعلیقیت کی 'مناسب قیمت' ادا کرنی پڑی ہوگی۔

مَیں نے ان کی ذات کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ غیب دانی پر مبنی نہیں۔ میری اس تمام تر اندازہ گیری کا سرچشمہ ان کی شاعری ہے۔ میں نے ان کی شاعری کو صِرف پڑھا نہیں بلکہ اسے محسوس بھی کیا اور ان کی شاعری کی نسبت سے اُن کی ذات کے باطن اور ظاہر میں گہرے گہرے سانس لیے۔ ہر چند کہ ان کی شاعری کے مطالعے کے لیے جو مہلت اور فضا درکار تھی وُہ مجھے نہیں مِل سکی۔ بہرحال ان کی شاعری نے میرے لیے ایک آئینے کا کام کیا، ایک ایسے آئینے کا کام جس میں مجھے ان کی مَرئی اور غیر مَرئی ذات متمثّل نظر آئی۔

مَیں جوان کے باب میں اِس دراز نفسی سے کام لے رہا ہُوں تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نادیدہ مگر خواندہ وجُود میں میراجی لگ رہا ہے جب کہ واقعیتِ واقعہ یہ ہے کہ بود نبُود کی اِس نوٹنکی میں میراجی کم کم ہی لگتا ہے اور وُہ یوں کہ ؎ تعمیر ہُوئی نہ دِل کی دُنیا — خُود کو بھی تباہ کر کے دیکھا (آفتاب حسین)

ان کی شاعری میں ایک بہت مانوس مگر قدرے جُداگانہ طورِ احساس کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے پُوری طرح سمجھ آنے والی باتیں کرتے ہیں، ایسی باتیں جو اَب سے پہلے قریب قریب اَن کہی رہی ہیں۔

؎ مقامِ شوق سے آگے بھی اِک رَستہ نکلتا ہے — کہیں کیا سِلسلہ دل کا کہاں پر جا نکلتا ہے
کلی کھِلی تو اُسی خُوش سخن کی یاد آئی — صَبا بھی اَب کے چلی سوگوار کرتے ہُوئے
خُود اپنے ہاتھ کی ہیبت سے کانپ جاتا ہُوں — کبھی کبھی کسی دُشمن پہ وار کرتے ہُوئے
میانِ شہر ہیں یا آئینوں کے رُوبرُو ہیں ہم — جسے بھی دیکھتے ہیں کچھ ہمیں جیسا نکلتا ہے

"مقامِ شوق" کی بات ایک محلّہ گیر، شہر گیر یا مجتمع گیر بات ہے جو قلی قطب شاہ سے لے کر اِس دَور تک عموماً

گفتنی اور شنیدنی رہی ہے مگر "مقامِ شوق" سے آگے بھی جو "رستہ نکلتا ہے" اس کی ایک مرموز نشان دہی آفتاب حسین نے کی ہے اور یہ وہ "رستہ" ہے جو اُن کے وجود کے کفِ پا کو پھولوں کے سوا اور کوئی سوغات نہیں دے سکتا۔
یہاں مجھے ایک اور بات کہنا ہے، وُہ یہ ہے کہ وہ ذات اور غیرِ ذات اور درُونِ ذات اور بیرونِ ذات کے درمیان باہمی سلسلہ کرنے کا ایک وحدیت پسند میلان رکھتے ہیں۔ مجھے اِس میلان کی ایک اور تعبیر بھی اختیار کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ وہ 'عین' اور 'غیر' میں ایک وجودی اور شہودی ایتلاف تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ سو یہاں جو بھی نکتہ دادطلب ہے وُہ یہ ہے کہ وہ اپنی اِس تخلیقی تلاش میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ؎

کلی کھِلی تو اُسی خوش سخن کی یاد آئی — صَبا بھی اَب کے چلی سوگوار کرتے ہوئے

"صَبا بھی اَب کے چلی سوگوار کرتے ہُوئے"۔ یہ حال خیز مصرع اُسی طورِ احساس کا ایک طراز ہے۔ جسے میں نے 'عین' اور 'غیر' کے درمیان ایک ایتلاف کی تلاش کا شیوہ جانا ہے۔

آفتاب حسین جس سماد ھائی اور اس کے ساتھ ہی جس طورِ طوری کے ساتھ مصرع پر مصرع لگاتے ہیں، وہ اس کے اجر سے ہرگز محروم نہیں رہیں گے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں متعدد مقامات پر جس احساسیاتی، جذباتی اور اظہاریاتی رویے کے انداز میں حال کھیلا ہے، وہ بلاشبہ توجہ طلب ہے ؎

خود اپنے ہاتھ کی ہیبت سے کانپ جاتا ہُوں — کبھی کبھی کسی دُشمن پہ وار کرتے ہُوئے

وہ اپنے اور اپنے "کسی دُشمن" کے درمیان جو اضافت قائم کرتے ہیں، وہ اضافت ایک عجیب شاعرانہ، نجیبانہ اور نبیلانہ (NOBLY) اضافت ہے جو شاعر کو ایک جمالیاتی اور تخلیقی متنفس کے طور پر ایک غیر شاعر سے متمیز کرتی ہے ؎

میانِ شہر ہیں یا آئینوں کے رُو بُرو ہیں ہم — جسے بھی دیکھتے ہیں کچھ ہمیں جیسا لگتا ہے

وہ "میانِ شہر" ہوں یا معاشرتی زندگی کرنے کی حالت میں ہوں یا اپنے آپ کو آئینہ پیشِ آئینہ کی رُو برُوئی میں پاتے ہوں یا ذاتِ ذات اور ذات در ذات کی خلوت میں ہوں اور اپنی چہرہ بہ چہرہ، رُو برو حضوری میں بیک وقت شاہد و مشہود کی حیثیت رکھتے ہوں، ہر دو وضع میں ذات کے غیرِ ذات اور غیر ذات کے ذات کا تمثل دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں بھی وہی صورتِ واقعہ پائی جاتی ہے جسے میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ 'عین' اور 'غیر' کے درمیان ایتلاف کا ایک شیوہ جانا اور سمجھا ہے۔

ذات ہو، محبوب ہو یا کوئی بھی نوعیتِ واقعہ یا اُن کا گرد و پیش وُہ سب سے ایک کھری معاملت رکھنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ پہلے ہی سے کچھ ایسا باتیں کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں جن کے بغیر اپنے ناطق پیرامون سے کوئی متناسب معاملت نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ وضع اخلاقی بھی ہے اور جمالیاتی بھی یعنی اِس وضعیتِ اَمر کی پاس داری کرنا اخلاقیات اور جمالیات دونوں سے لزومی نسبت رکھتا ہے۔ اِس پاس داری کے بغیر ذات اور غیرِ ذات کی نسبت سے کوئی معتبر اور متجمّل زندگی نہیں کی جا سکتی ؎

بس ایک بات کی اُس کو خبر ضروری ہے — کہ وہ ہمارے لیے کس قدر ضرُوری ہے
دِلوں میں دَرد کی دولت بچا بچا کے رکھو — یہ وہ متاع ہے جو عمر بھر ضروری ہے
دیکھیے کوئی تعلقِ خاطر کے رنگ بھی — اُس فتنہ خُو سے پیار بھی ہے اور جنگ بھی
پیچ خم اُلجھو کہ کرا ہو صاحب — دِل دیا ہے تو نبھا ہو صاحب
موت کے درد کا درماں معلوم — زندگانی کی دَوا ہو صاحب

اِن اشعار کی نسبت سے میں اُن کی شاعری کو ایک گزیدہ شاعری قرار دینے پر تقریباً خصوصی اصرار رکھتا ہوں جس کی گزیدگی کے کھون دبروز کا عمُودی تعیّن مندرجہ بالا شعروں میں ہُوا ہے اور آخری شعر اِس عمُودی تعیّن کا ایک ارجمند اعلامیہ ہے ؎ موت کے دَرد کا دَرماں معلوم — زندگی کی دَوا ہو صاحب

مجھے ایک بات کہہ دینی چاہیے۔ وہ بات یہ ہے کہ میں نے نصابی طور کی مربوط اور مرتب نگارندگی کی کبھی ادنیٰ سے ادنیٰ اشتہا بھی محسوس نہیں کی۔ میرے سلسلۂ فکر اور غیر نصابی ربط و ترتیب کا اپنا ایک اَٹل ٹپ ڈھب ہے جسے فضلائے نقد و نظر (بے چارے) پورے جواز کے ساتھ ایک بے ڈھنگا پن قرار دے سکتے ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ میں آفتاب حسین کے مسودے کی وَرق گردانی کے دَوران اس لمحے ان کی شاعری کے ایک لائق تذکرہ جہت سے اچانک مواجہ ہوگیا ہوں۔ مجھے ان کے کلام میں جگہ جگہ احساس و اظہار کے درمیان ایک تساوی محسوس ہوتی۔ احساس و اظہار کی تساوی کے لیے ایک ضروری ہُنرمندی چاہیے۔ میں یہاں نگارش کا یہ اُسلوب بھی اختیار کرسکتا ہوں کہ ان کے ہاں مجھے احساس و اظہار کی ثنویت میں توجہ طلب دَرجے تک ایک پُر تجلّی واحدیت کا اِدراک ہوا۔ ان کے متعدد شعروں کی لفظی اور معنوی وَحدتوں میں وحدتِ روحیہ (MONADS) کے باہمی دَروبست اور انجام کا ایک غیر مبہم طور دکھائی دیتا ہے۔ میں اپنی اِس بات کو مَرئی اور مسموع بنانے کے لیے خداوندِ غزل حضرت رود کی طاب ثراہ کی اُس چند شعروں کی شہرۂ آفاق نظم کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس کے حُسنِ تالیف پر کتنے ہی دیوان نثار کیے جاسکتے ہیں۔ اس کا مطلع ملاحظہ فرمایئے ؂

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی — یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

اِس نظم میں احساس و اظہار کے درمیان جو نسبت پائی جاتی ہے میں اسے احساس و اظہار کی تساوی سے تعبیر کرتا ہوں یہ تساوی کبھی کبھی شعر کو سِحر اور سحر کو اعجاز بنادیتی ہے۔ اب آفتاب حسین کے چند شعر سُنیے۔

؂ پھول سے اُڑ گئی ہے خوشبو بھی — کاش یہ بات سوچتا تُو بھی — احساس = اظہار

؂ اپنے ہونے سے یا نہ ہونے سے — فرق پڑتا نہیں سَرِ مُو بھی — احساس = اظہار

؂ بے طلب گھومتے رہنے نے دکھائے کیا دن — یاد بھی اَب نہیں آتا کہ طلب تھی کوئی — احساس = اظہار

تِرے بدن کے گلستاں کی یاد آتی ہے — خُود اپنی ذات کے صحرا کو پار کرتے ہُوئے — احساس = اظہار

آپ ان شعروں سے ایک انفعالی یا دُوسرے لفظوں میں تاثراتی، ایک سچّا تاثراتی رِشتہ قائم کرسکیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ احساس و اظہارِ فن کے دَریا میں پہلو بہ پہلو شناوری کر رہے ہیں۔ فرہنگ اور آہنگ کی دُوئی نے 'یکی' میں تمثّل کیا ہے۔

آفتاب حسین نے اپنی شاعری میں زندگی کی 'حقیقت' سے ایک معنی آگیں تعلق رکھا ہے۔ ان کی شاعری اور زندگی کے درمیان جو اضافت پیرا پرداز ہوئی ہے وہ خیال پسندانہ نہیں بلکہ واقعیت ساماں ہے۔ وُہ واقعیت میں اپنے طور سے نفس زن دکھائی دیتے ہیں اور اُن کا اپنے طور سے نفس زن رہنا ایک برجستہ حالت انگیزتری اور پیرامون پُوری طرح کرتا ہے۔ ؂ ہم تو ہیں مثلِ پرِ کاہ، ہمارا کیا ہے — ڈُوبتے جاتے ہیں دریا میں شناور کیا کیا

؂ ایسا نہیں کہ آٹھ پہر بے دِلی رہے — بجھتے ہیں غم کدے میں کبھی جلترنگ بھی

؂ ایک ذرا سی بات تھی لیکن طرح طرح کے پیچ پڑے — کتنے کام آسان ہُوتے ہیں اور کتنی آسانی سے

"ڈوبتے جاتے ہیں دَریا میں شناور کیا کیا" یہ احساس پہلے مَرحلے میں واقعیتی ہے۔ دُوسرے مَرحلے میں جبریتی اور تیسرے مرحلے میں ابداعیانہ انفعالیتی۔ یہ بات اس طرح بھی کہی جاسکتی ہے کہ یہ شعر اپنے بالائی تہ میں خبر نگاری (REPORTING) سے عبارت ہے دُوسری تہ میں ایک کونیاتی (COSMOLOGICAL) جہت (جبریت) کا اشاریہ ہے اور اپنی سب سے زیریں تہ میں 'ابداعیانہ انفعالی' بلکہ میں تو یہاں ایک یکسر غیر منطقی طورِ بیان کو کام میں لاتے ہُوئے یہ کہوں گا کہ یہ ایک 'فعّال انفعال' کا منظر ہے۔ "ایسا نہیں کہ...... بجھتے ہیں غم کدے میں کبھی......" اس شعر میں شاعر بظاہر کس قدر غیر شاعرانہ کارپردازی

سے کام لے رہا ہے۔ وہ بالکل ایسی بات کہہ رہا ہے کہ میں کبھی تو ناشتا کرکے دفتر جاتا ہوں اور کبھی ناشتا کیے بغیر چلا جاتا ہوں لیکن اس شعر کی جو رگِ جاں ہے وہ بہت آفت ساماں ہے۔ اِس میں شعر کی تمام تر شخصیت، مرتکز ہو گئی ہے اور ایک غیر شاعرانہ کارپردازی نے ماجرا نائی کا طراز پالیا ہے اور وہ "رگِ جاں" ہے "بے دِلی" "ایسا نہیں کہ آٹھ پہر بے دِلی رہے" اب دُوسرے مصرعے کو گنگنائیے۔ اِس مصرع کا مرکز ہے "۔۔۔۔۔۔ غم کدے میں کبھی ۔۔۔۔۔۔" اب یہ شعر دوبارہ پڑھیے ؎

ایسا نہیں کہ آٹھ پہر بے دلی رہے　　　بجتے ہیں غم کدے میں کبھی جلترنگ بھی

سوچیے تو سہی کہ ایک صحافیانہ قسم کے معاملے کا کیسا قلبِ ماہیت (METAMORPHOSIS) ہوا ہے۔

؎ ایک ذرا سی بات تھی لیکن طرح طرح کے پیچ پڑے　　　کتنے کام آسان ہوئے ہیں اور کتنی آسانی سے

"ایک ذرا سی بات تھی ۔۔۔۔۔۔" یعنی ایک بے بات سی بات۔ مگر اس بے بات سی بات کا شاعر اپنے لڑکپن میں کوئی ہٹونٹ قسم کی 'شے' نہیں رہا۔ وہ ۱۴ ویں شعبان یعنی شبِ برات کی آتش بازی کی تیاری میں اپنے سگے بڑے بھائی یا عم زاد یا خالہ زاد کے ساتھ جنگل سے بن جھپٹیاں (آک) کاٹ کر لاتا رہا ہوگا تاکہ انھیں جلا کر انار، انارکھیوں کی بارُود کے لیے کوئلہ تیار کیا جاسکے۔ ہوسکتا ہے اُسے اشرفی کا وزن معلوم نہ ہو لیکن اُس کے بڑے بھائی تو ظاہر ہے کہ 'اشرفی' اور 'بیل' کا وزن جانتے ہی ہوں گے۔ بارُود کا 'دانہ' تیار کرنے کے لیے وُہ یا اُس کے بڑے بھائی آس پڑوس کی دیگچیاں اور لوٹے چرایا کرتے اور انھیں دھونکنی میں گلاتے ہوں گے اور پھر 'دانہ' تیار کرنے کی خاطر پیتل اور تانبے کے ٹکڑوں کو ہاون دستے میں کُوٹ کُوٹ کر ان کا سفوف بنانے کے دَوران ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے ہوں گے۔ ۱۴ ویں شعبان کو سرِ شام سے سرِ شب اور سرِ شب سے آخرِ شب۔ پھر کسی ندی یا دریا کے کنارے نمازِ فجر پڑھ کر جناب حسینؓ ابنِ رُوحؒ کے توسط سے حضرتِ حجت قائم آلِ محمدؐ کے نام (امتحان میں کامیابی یا کسی لڑکی کا دِل جیتنے کے لیے) عریضہ ڈالنے کے بعد وہ اپنے بھائیوں اور محلّے کے یاروں کے ساتھ شتابا لگا کر اُڑن بتاشے چھوڑتے اور ناشپال اُڑاتے آتے ہوں گے۔ یہاں مجھے 'لسان القوم' حضرت مولانا صفی لکھنوی کا ایک شعر یاد آ گیا جو یہ ہے۔ نہیں، پہلے میں اُن کا ایک اور شعر سُناؤں گا جو مجھے اِس پل یاد آرہا ہے۔ یہ شعر سُنّی اور شیعہ رِشتے، اٹوٹ رشتے سے متعلق ہے ؎

پردہ ہائے سازِ رنگا رنگ تھے　　　چھیڑ دے کوئی تو ہم آہنگ تھے

اب وہ شعر سُنیے جو میرے ذہن میں پہلے آیا تھا ؎

صبح صادق ہے ادا کر کے فریضہ ساقی　　　پیش کر دے ابھی میرا بھی عریضہ ساقی

بات آفتاب حسین کے ایک شعر سے چلی تھی جو یہ ہے۔

؎ ایک ذرا سی بات تھی لیکن طرح طرح کے پیچ پڑے، کتنے کام آسان ہوئے ہیں اور کتنی آسانی سے

آفتاب حسین نے انار، پھلجھڑی، مہتاب، گدّی کے پٹاخے، بتاشے، بچھو، بیل، نرّی اور اشرفی کو 'شتابا' لگانے کی طرح اِس شعر میں بھی ایک شتابا لگا دیا ہے۔ وُہ شتابا کیا ہے۔ وُہ ہے "ذرا سی"۔

؎ ایک ذرا سی بات تھی لیکن طرح طرح کے پیچ پڑے　　　کتنے کام آسان ہوتے ہیں اور کتنی آسانی سے

اُن کی اِس قصّہ افزائی کے نتیجے میں کیفیت کی جو رنگ روشنی طور افروز ہوتی ہے اُس کی داد صرف دیدۂ دِل سے ہی مل سکتی ہے یا شاید ایسا نہ ہو، یہ صرف میرا گمان ہو۔

میں ابھی آفتاب حسین کی شاعری اور زندگی کے باہمی رِشتے کے بارے میں نفس زنی کر چکا ہوں۔ اس

نفس زَنی کے دوران میں 'زندگی' کے اصطلاحی مفہوم کو یکسر ملحوظ نہیں رکھا۔ میں نے تو زندگی کے زندہ اور 'زندہ' مفہوم سے موانست رکھی ہے۔ جو بات اب مجھے کہنا ہے وُہ یہ ہے کہ 'وقت' (زمان) بھی اُن کی شاعری کا ایک قضیہ ساز مسئلہ ہے جسے انھوں نے 'تہ دارتھی' کے ساتھ برتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وقت خارج میں بھی پایا جاتا ہے یا نہیں اَور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ خارج سے آخر کیا مراد ہے؟ بہرحال تو ہے یوں کہ 'وقت' سے آفتاب حسین کی غزل کا ایک پرانفعال تخلیقی علاقہ ہے۔

ے رنگِ رخسار پہ اترائو نہیں　　　　جانے کب وقت اُڑا کر لے جائے

ے ایک ہی منظر دیکھ رہا ہوں اِس بے انت خرابے میں　　　　ایک ہی صورت جھانک رہی ہے صدیوں کی ویرانی سے

ے وہ بادِ تیز ہے کہ کہاں شعلۂ غمیں　　　　نایاب ہوگیا ہے یہاں دُودِ آہ تک

ے بدل رہے ہیں زمانے کے رنگ کیا کیا دیکھ　　　　نظر اُٹھا کہ یہ دُنیا ہے دیکھنے کے لیے

آئن سٹائن نے وقت (زمان) کو 'موجود' کا چوتھا بُعد قرار دیا ہے۔ اِسی طرح کی بات صفوی عہد کے عظیم فلسفی صدرالدین شیرازی نے بھی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "اسفارِ اربعہ" میں کہی ہے اور آئن سٹائن سے کئی صدی پہلے کہی ہے۔ قصہ کوتاہ، آئن سٹائن نے 'زمان' کو مکان (SPACE) سے جُدا کر کے کوئی بھی حیثیت ارزانی نہیں کی۔ انھوں نے زمان کو کبھی تنہا اِستعمال نہیں کیا۔ (میرے مطالعے کی حد تک) اور "زماں مکاں" (SPATIO-TEMPORAL) کی اصطلاح وضع کی۔ اُن سے پہلے زمان (وقت) کے بارے میں ارسطو کے عہد سے لے کر اُنیسویں صدی کے مغرب میں وُہی کچھ کہا جاتا رہا جو ہم یعقوب کِندی سے لے کر اُنیسویں صدی کے نام بردہ فلسفی مُلّا ہادی سبزواریؒ سے سُنتے چلے آئے ہیں کہ "الزمانُ ھُوَ مقدارالحرکۃ" یعنی زمان حرکت کی مقدار سے عبارت ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ زمان (عام زبان میں زمانہ یا وقت) فلسفے اور سائنس سے کوئی گرم جوش رشتہ نہیں رکھتا۔ وُہ مذاہب میں خصوصی طور پر جین مت اور فنونِ لطیفہ میں شاعری سے نہایت گرم جوش رشتہ رکھتا ہے۔ خاص طور پر فارسی شاعری سے اس کا مبدعانہ ترین اور بے حد تاثر آگیں رشتہ پایا جاتا ہے۔ اُردو میں اِس رشتے کی عالی ترین مثالیں خدائے سخن سیّد محمد تقی میر کی غزلوں میں ملتی ہے۔ ہاں تو میں 'وقت' یا 'زمان' کی نسبت سے آفتاب حسین کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہ رہا تھا۔ وقت یا زمان ان کی شاعری کا ایک ارزِندہ موضوع ہے۔ "جانے کب وقت اُڑا کر لے جائے" "ایک ہی منظر . . . . اِس بے انت خرابے میں" "ایک ہی صورت . . . . صدیوں کی ویرانی سے" . . . . بادِ تیز . . . شعلۂ غمیں" . . . . دُودِ آہ" . . " بدل رہے ہیں زمانے کے رنگ . . . . ." ان شعروں میں وقت کا ایک پُر ملال اَور پُرخیال احساس جذبے کے آہنگ میں صورت طراز ہوا ہے اور احساس کی اِس پُرملالی اور پُرخیالی نے ایک حُزن آور جمالیات تخلیق کی ہے۔ یہ حُزن آور جمالیات انسانی شعور یا نفسِ شاعرہ کی سزا بھی ہے اور جزا بھی۔ میں ان شعروں کی دِلی داد دینا چاہتا ہوں۔

آفتاب حسین نے چند غزلیں ان بحروں میں بھی کہی ہیں جو عَربی شاعری سے مختص ہیں۔ یہ بحریں وہ ہیں جنھیں گزشتہ گیارہ سو برس کے دَوران فارسی اور اُردو شاعری کے آہنگ نے پُورے دل سے قبول نہیں کیا۔ یہاں میں آفتاب حسین کی اُن چند غزلوں کا ایک ایک مِصرع آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے:

ع قیام کرنے چلا ہُوں میں اِک نئی زمیں پر

ع کسی کے اِنتظار میں نہیں ہوں

ع گئے منظروں سے یہ کیا اُڑا ہے نگاہ میں

میں نے ان غزلوں کو پڑھا اور ان کے کُنہِ وجود پر غور کیا۔ میں نے سوچا کہ آفتاب حسین جیسے غنائی لہجے

کے شاعر نے (اُردو کی حد تک) اِس 'اڑنگ بڑنگ' قسم کی لَے سے اپنی لَے کیوں ملائی؟ سوچتے سوچتے میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ آفتاب حسین کتنے ہی شیوہ بیان شاعر کیوں نہ ہوں مگر ہیں تو اکتیس بتّیس برس کے برخوردار اُن کے جی میں آئی ہوگی کہ وہ 'اُستادانہ دار' سخن کریں اور اپنے قارئین اور سامعین سے یہ بات منوائیں کہ میں اُستاد الشعرا حضرت مقتضب کرنالی کے درجے کا ماہرِ فن ہوں۔ اِس قسم کی بحروں میں وہی لوگ شعر کہنا پسند کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اُردو کا اُمراء القیس، اعشیٰ، زہیر ابن ابی سلمیٰ یا نابغہ ذُبیانی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ میں بھی ایک زمانے میں جب ہندوستان کا شہری تھا، یہ شہرت رکھتا تھا کہ مجھے اپنی شاعری کے صوری اعتبار سے امرءالقیس یا نابغہ ذُبیانی وغیرہ کا مرتبہ حاصل ہو۔ سو اِس مرتبے کو حاصل کرنے کے لیے میں عربی میں شعر کہتا تھا اور وہ بھی مختص ترین عربی بحروں میں، اُن بحروں میں جنھیں فارسی اُردو شاعر کم ہی سہار سکے۔ غالب نے بھی دو ایک غزلیں نسبتاً نامانوس بحروں میں کہی ہیں لیکن وہ بھاڑ جھونکنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکے۔ اللہ انھیں معاف کرے۔ میرا مشورہ ہے کہ آفتاب حسین ان غزلوں کو جو پانچ چھ سے زیادہ نہیں فوراً پھاڑ پھینکیں۔

"جون ایلیا! غصّہ تھوک دو اور تیہا دکھا چکو اور بات کو آگے بڑھاؤ" "اچھا تو بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔ مگر میں بات کیے بغیر نہیں رہ سکتا چاہے اُس بات کو میری فارِہہ میری جانِ جاں کے خسم محلّہ شیخ لدّہ بھی کاٹنا چاہیں اور وہ بات یہ ہے کہ شاعری کسی بھلے مانس یا پُرامن شہری سے لاالیری کا رشتہ رکھنا بھی گوارا نہیں کرتی" سو میرے لیے جو سب سے زیادہ اطمینان کی بات ہے، وہ یہ ہے کہ "آفتاب حسین" ایک 'نیم پُرامن' قسم کے شہری ہیں۔ مگر یہ 'نیم پُرامن' کی ترکیب چہ معنی دارد؟ 'پُرامن' کا سابقہ 'نیم'، 'نیم' کا لاحقہ 'پُرامن'! یہ کیا بات ہوئی؟ چلو یار جو بات ہوگئی، ہوگئی۔

آفتاب حسین کی غزلوں کی صوریت کی نسبت سے میرے ذہن نے ایک 'حال حالی' کے ساتھ جو ارتسام قبول کیا اُس کو شاید اِس طرح معرضِ تعبیر میں لایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک 'نو کلاسیکی' شاعر ہیں۔ یعنی بات کچھ یوں ہے کہ ان کے کلام کو پڑھ کر متعدد بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میر میں شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی امروہوی کی قلم لگی ہو یا شیخ غلام ہمدانی مصحفی میں میر کی قلم۔ اگر یہ وضعیتِ معاملہ انیسویں صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں صورت پذیر ہوتی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس شاعر کا اُسلوب میر کے اُسلوب اور مصحفی کے اُسلوب کا آمیزہ ہے اور بس مگر یہاں جو معاملہ ہے اُس کی نوعیت کچھ اور ہے یعنی آفتاب حسین کا اُسلوب میر اور مصحفی کے اُسلوبوں کی ثنویت کا نتیجہ نہیں ہے۔ اِس لیے کہ آفتاب حسین بیسویں صدی کے اواخر میں سخن سرا ہیں۔ اُن کے احساس، تخیل اور جذبے کا گرد و پیش اور اُن کے فکری اور اجتماعی مسئلوں کا پیرامون اُنیسویں صدی کے اوائل اور اواسط سے بے حد مختلف ہے اور اِس اختلاف نے ان کے کلام کی صوریت کو 'اقانیم ثلاثہ' کے 'ابتدائی' امتزاج کی کیف طرازی میں متشکل کیا ہے۔ چنانچہ ان کا اُسلوب نہ میر کے اُسلوب کا مثنیٰ ہے اور نہ مصحفی کے اُسلوب کا اور نہ اِن دونوں کے اسالیب کا۔ یہ اُسلوب روایت کے تاریخی، عمرانی، نفسیاتی اور جمالیاتی بہم پیوستگی (CONTINUITY) کا ایک طور ہے۔ بایں ہمہ میں آفتاب حسین کو پوری معاملہ شناسی کے ساتھ متنبہ کر دینا اپنا برادرانہ فرض سمجھتا ہوں کہ وہ میر اور مصحفی کا مطالعہ اب یکسر ترک کر دیں۔ میں نے اپنے ان خاندانی اور شہری بزرگوں کا مطالعہ اُنیس بیس سال کی عمر میں یک دفعہ ترک کر دیا تھا۔[1]

یہ ایک استطرادی بات تھی یا یوں کہیے کہ میں نے اپنی ہی بات کو لکھ دیا تھا۔ باتوں کی بات وہی ہے جو میں نے اس سلسلۂ بیان کے شروع میں کہی تھی یعنی آفتاب حسین اپنی نہادِ نہاد اور اُفتادِ افتاد میں ایک نو کلاسیکی شاعر ہیں اور اُن کا اپنا ایک تقریباً منفرد سا قرینہ ہے۔

ؔ وہ کام کہ تھا نپٹ خرابی — وہ کام بھی گاہ کر کے دیکھا

دیکھیے اِس شعر میں میر اور مصحفی کا کیسا صورت افروز ائتلاف ہوا ہے۔ "نپٹ خرابی"۔ "۔۔۔ گاہ کر کے دیکھا"

~ رات اُس حُسنِ دلآرام کی چھب تھی کوئی — تم نے دیکھی نہیں کل رات غضب تھی کوئی

اِس شعر میں "تم نے دیکھی نہیں" نے میر اور مصحفی کی اِثنینیت سے ایک قدرے جُداگانہ چگونگی کسب کی ہے۔

~ اُس شوخ کو دیکھنے گئے تھے — حسرت سے اِک آہ کر کے دیکھا

~ چیخ اُٹھو کہ کراہو صاحب — دِل دیا ہے تو نباہو صاحب

~ موت کے درد کا درماں معلوم — زندگانی کی دَوا ہو صاحب

~ تعمیر ہوئی نہ دِل کی دنیا — خُود کو بھی تباہ کر کے دیکھا

اگر آپ اِن سطروں کو احساس اور اظہار کی محرمی کے ساتھ پڑھیں تو میرے گمان کے مطابق آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ میر اور مصحفی کی سخن سرائی کے دوران کسی دقیقے، کسی ثانیے سے کوئی تیسرا سخن در سخن سرا ہو گیا ہے۔ ایک ایسا سخن ور جو نہ اُنیسویں صدی کا شہری ہے اور نہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل کا بلکہ وہ بیسویں صدی کے آٹھویں دہے سے تعلق رکھتا ہے۔

"چیخ اُٹھو کہ کراہو صاحب"، "زندگانی کی دَوا ہو صاحب"، "تعمیر ہوئی نہ دل کی دُنیا"۔ پہلا مصرع ہو یا دُوسرا اور تیسرا مصرع، ان کا انیسویں صَدی کی لسانی جمالیات سے ایک تاثر اندوز تعلق تو ضرور ظاہر ہوتا ہے مگر یہ ایک حقیقتِ حقیقت ہے کہ اُنیسویں صَدی کا کوئی بھی شاعر ان مصرعوں کی تخلیق نہ کرتا۔

آپ ان اشعار کو احساساتی، جذباتی اور جمالیاتی یا فنی اِنفعالیت کے ساتھ پڑھتے چلے آتے ہیں اور شاعر کی اور اپنی کیفیاتی نسبیت میں نفس نفس چلتے گئے ہیں۔ اب آپ یہ شعر ملاحظہ فرمائیے

~ دُنیا سے علیحدگی کا رستہ — دُنیا سے نباہ کر کے دیکھا

آپ نے یہ شعر ملاحظہ فرمایا۔ اب میری یہ بات شاید آپ کے لیے قابلِ قبول ہو کہ آفتاب حسین کی غزل نو کلاسیکی غزل ہے اور نو کلاسیکیت کا تعلق قدیم اور جدید یعنی تقویم سے نہیں ہے بلکہ ایک خاص معنی میں اظہارِ نفس اور نفسِ اظہار کے باطنِ باطن کی اضافت، ذات کی برشتگی، نفس نفس گزشتگی اور زبان کے ایک خاص برتاؤ سے ہے۔ اسی نفس نفس گزشتگی پر احساس گزشتگی اور شعُور رآگیں رَوندگی کے عالم میں ہمیں اقانیمِ ثلاثہ کے اس ابداعی امتزاج کا سراغ ملتا ہے، جس نے مجھے میر، مصحفی اور آفتاب حسین کے لمحہ لمحہ نفس زناں، رَواں دَواں اور دور رَزاں رشتے کا احساس دلایا۔

میں نے اِس سلسلۂ بیان میں سب سے پہلے جو شعر نقل کیا تھا:

~ رات اُس حُسنِ دلآرام کی چھب تھی کوئی — تم نے دیکھی نہیں کل رات غضب تھی کوئی

اور سب سے آخر میں جو شعر نقل کیا ہے، وہ ماجرا پرور شعر یہ ہے:

~ دُنیا سے علیحدگی کا رستہ — دُنیا سے نباہ کر کے دیکھا

میر اور مصحفی سے لے کر آفتاب حسین کی غزل کا یہ تہذیبی، عمرانی، نفسیاتی، وجودیاتی اور جمالیاتی سفر کتنا اور کیسا واقعہ انگیز ہے اور کس قدر باہم پیوستہ! یہاں میں آفتاب حسین کے ایک خاص لفظ کے نستعلیق ترین اِستعمال کی دِلی داد چاہتا ہوں

ع دُنیا سے علیحدگی کا رستہ

اُردو صرف میری مادری زبان ہی نہیں بلکہ میں بجائے خُود اُردو ہوں اور پُورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ میں نے "علیحدگی" کا اس سے زیادہ سبک، سجل اور سڈول اِستعمال اب تک نہیں دیکھا۔ الحاصل ان کی شاعری کی نسبت سے میں جو بات کہنا چاہتا ہوں، وُہ یہ ہے کہ آفتاب حسین کھری اُردو، ٹکسالی اُردو بلکہ اُردوئے معلّیٰ کے شاعر ہیں۔ مجھے ان کا کلام پڑھ کر اور اپنی غزلیں یاد کر کے یوں محسوس ہُوا کہ جیسے میں لاہور میں پیدا ہُوا تھا اور آفتاب حسین امروہے میں۔

سیمانت پرکاشن
دریا گنج - نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲